اُمُّ الکتاب

"تفسیرِ سُورۂ فاتحہ"

ابوالکلام آزاد

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 092086
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

Masood Faisal Jhandir Library

اُمّ الکتاب

تفسیر سورۂ فاتحہ

از

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

○

ناشر

مدنی کتب خانہ گنپت روڈ لاہور ۲

بار ... اوّل

تعداد ... ۱۰۰۰

ہدیہ ... [redacted] روپے

مطبوعہ :- منصور پریس لاہور

فہرس اُمّ الکتاب

اُمّ القرآن یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ

(۱) سورت کی اہمیت اور خصوصیات	۵۱
سورۂ فاتحہ میں دین کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے۔	۵۱
دین حق کا ماحصل	۵۲
سورۂ فاتحہ کے اسلوبِ بیان	،،
دینِ حق کی مہمات	۵۴
(۲) الحمد للہ	۵۶
حمد	،،
اللہ	۵۷
ربُّ العالمین	۵۹
نظامِ ربوبیت	۶۰
پانی کی بخشش و تقسیم کا نظام	۶۱
تقدیرِ اشیاء	،،
عناصرِ حیات	۶۲
نظامِ پرورش	،،
نظامِ ربوبیت کی وحدت	۶۳
ربوبیتِ معنوی	۶۵
تقدیر	،،
ہدایت	۶۶
ہدایتِ وجدان	۶۷
ہدایتِ حواس	،،
براہینِ قرآنیہ کا مبداءِ استدلال	۶۹
دعوتِ تعقل	،،
تخلیق بالحق	،،
مبداءِ استدلال	۷۱
بُرہانِ ربوبیت	۷۲
نظامِ ربوبیت سے توحید پر استدلال	۷۷
نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال	،،

نظامِ ربوبیت سے وجودِ معاد پر استدلال	۷۹
(۳) الرحمٰن الرحیم	۸۲
رحمت	،،
تعمیر و تحسین کائنات رحمت کا نتیجہ ہے	۸۳
افادہ و فیضانِ فطرت	۸۴
کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لیے ہے	۸۸
جمالِ فطرت	۸۹
بلبل کی نغمہ سنجی اور زاغ و زغن کا شور و غوغا	۹۰
فطرت کی حُسن افروزیاں اور رحمتِ الٰہی کی بخشش	،،
قدرت کا خود روسامانِ راحت و سرور اور انسان کی ناشکری	۹۱
جمالِ معنوی	۹۳
بقاءِ انفع	۹۴
تدریج و امہال	،،
اصطلاحِ قرآنی میں "اجل"	۹۵
تکوینیہ	،،
تاخیرِ اجل	۹۶
تدریج و امہال اچھائی اور برائی دونوں کے لیے ہے۔	،،
تسکینِ حیات	۹۷
زندگی کی محنتیں اور کاوشیں	،،
مشغولیت اور انہماک	،،
حالات متفاوت ہیں لیکن زندگی کی دلبستگی اور ہمہ گیری سب کے لئے ہے۔	،،
اشیاء و مناظر کا اختلاف و تنوع اور تسکینِ حیات	۹۸
اختلافِ لیل و نہار	،،
دن کی مختلف حالتیں اور رات کی مختلف منزلیں	۹۹

حیوانات کا اختلاف	۹۹
نباتات	″
جمادات	۱۰۰
ہر چیز کے دو دو ہونے کا قانون	″
مرد اور عورت	۱۰۱
نسب اور صہر	″
صلہ رحمی اور خاندانی حلقہ کی تشکیل	″
ایامِ حیات کا تغیر و تنوع	۱۰۲
زینت و تفاخر، مال و متاع، آل و اولاد	″
اختلافِ معیشت اور تزاحمِ حیات	۱۰۳
برہانِ فضل و رحمت	″
موزونیت و تناسب	۱۰۴
تسویہ	″
اتقان	۱۰۵
رحمت سے معاد پر استدلال	″
رحمت سے وحی و تنزیل کی ضرورت پر استدلال	″
انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر رحمت سے استدلال	۱۰۶
بقاءِ "انفع"	۱۰۷
حق اور باطل	″
قانون "قضا بالحق"	۱۰۸
اللہ کی صفت بھی "الحق" ہے۔	″
وحی و تنزیل بھی "الحق" ہے۔	″
قرآن کی اصطلاح میں "الحق"	۱۰۹
نزاعِ حق و باطل	″
اللہ کی شہادت	″
"قضاء بالحق" مادیات اور معنویات کا عالمگیر قانون ہے	۱۱۰
"انتظار" اور "تربص"	″
تدریج و امہال اچھائی اور برائی دونوں کے لئے ہے	″
"تاجیل"	″
قوانین فطرت کا معیارِ اوقات	۱۱۱
استعجال بالعذاب	۱۱۲
العاقبة للمتقین	″
قرآن کی وہ تمام آیات جن میں ظلم و کفر کے لیے فلاح و کامیابی کی نفی کی گئی ہے۔	″ ۱۱۳
"تمتیع"	″

"قضاء بالحق" اور اقوام و جماعات	۱۱۳
"قضاء بالحق" کے اجتماعی نفاذ میں تدریج و امہال اور تاجیل ہے۔	۱۱۴
انفرادی زندگی اور مجازات دینوی	۱۱۵
معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ و انابت	۱۱۶
رحمتِ الٰہی اور مغفرت و بخشش کی وسعت و فراوانی	″
اسلامی عقائد کا ذہنی تصور اور "رحمت"	″
خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے	۱۱۷
جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ اُس کے بندوں سے محبت کرے۔	″
اعمال و عبادات اور اخلاق و خصائل	۱۱۸
قرآن سرتاسر رحمتِ الٰہی کا پیام ہے	″
بعض احادیث باب	۱۱۹
مقامِ انسانیت اور صفاتِ الٰہی سے تخلق و تشبہ	۱۱۹
احکام و شرائع	۱۲۰
انجیل اور قرآن	۱۲۱
دعوتِ مسیح اور دنیا کی حقیقت فراموشی	″
حضرت مسیح کی تعلیم کو فطرتِ انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے۔	۱۲۲
مواعظِ مسیح کے مجازات کو تشریح و حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔	۱۲۳
اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے نہ کہ تعزیر و انتقام	۱۲۴
"عمل" اور "عامل" میں امتیاز	۱۲۵
مرض اور مریض	۱۲۵
گناہوں سے نفرت کرو مگر گنہگاروں پر رحم کرو	″
قرآن، اور گنہگار بندوں کے لئے صدائے تشریف و رحمت	۱۲۶
اصلاً انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں	۱۲۷
قرآن کے زواجر و قوارع	۱۲۸
کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ	″
(۵) مالکِ یوم الدین	۱۳۱
الدین	″
"دین" کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کر دی	″
مجازاتِ عمل کا معاملہ بھی یک عالمگیر قانونِ فطرت کا ایک گوشہ ہے۔	۱۳۲

جس طرح مادیات میں خواص و نتائج ہیں اسی طرح معنویات میں بھی ہیں ۔	۱۳۲
اصطلاح قرآنی میں "کسب"	۱۳۳
من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا	۱۳۴
الدین یعنی قانون و مذہب	۱۳۵
مٰلک یوم الدین" میں عدالت الٰہی کا اعلان	〃
کارخانہ ہستی کے تین معنوی عناصر ربوبیت، رحمت، عدالت	۱۳۶
تعمیر و تحسین کے تمام حقائق دراصل عدل و توازن کا نتیجہ ہیں	〃
وضع میزان	۱۳۷
اعمال انسانی کا عدل و قسط پر مبنی ہونا قرآن کی اصطلاح میں "عمل صالح" ہے ۔	〃
بدعملی کے لئے قرآن کے اختیارات لغویہ	۱۳۸
قرآن اور صفات الٰہی کا تصور	۱۳۹
انسان کا ابتدائی تصور	〃
انیسویں صدی کے نظریے اور ارتقائی مذہب	〃
مذہب ارتقاء کا خاتمہ اور زمانہ حال کی تحقیقات	۱۴۳
آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات	۱۴۴
دجلہ و فرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصور	۱۴۴
جستجو دارو کا خدائے واحد "ادن"	۱۴۵
"اللہ" کی یگانہ اور ان دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصور	〃
انسان کی پہلی راہ ہدایت کی تھی، گمراہی بعد کو آئی	〃
دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن کا اعلان	۱۴۶
ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں مگر اسکی صفات کے تصورات کے مطالعے میں مدد دیتا ہے	۱۴۷
عقل انسانی کی درماندگی اور صفات الٰہی کی تشبیہ سازی	〃
ارتقائی تصور کے نقاط ثلاثہ	۱۴۸
انسان کا تصور صفات قہریہ کے تاثرات سے کیوں شروع ہوا	
فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہر کا حسن و جمال	۱۴۹
بالآخر صفات رحمت و جمال کا استیلاء	
ظہور قرآن کے وقت دنیا کے عام تصورات (۱) چینی تصور	〃
لاؤزے، نزد اور کنگ فوزی کی تعلیم	۱۵۰
چین کا شمنی تصور	۱۵۱
(۲) ہندوستانی تصور	۱۵۲
اوپانی شد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصور	۱۵۲
شمنی مذہبی اور اس کے تصورات	〃
(۳) ایرانی مجوسی تصور	۱۵۹
مزدیُنا	۱۶۰
(۴) یہودی تصور	۱۶۱
(۵) مسیحی تصور	〃
خلاصہ یونان و اسکندریہ کا تصور ۔	۱۶۲
اسکندریہ کا مذہب افلاطون جدید	۱۶۶
قرآنی تصور	۱۶۸
(۱) تنزیہہ کی تکمیل	۱۶۹
تنزیہہ اور تعطیل کا فرق	〃
آریائی اور سامی نقطۂ خیال کا اختلاف	۱۷۳
محکمات اور متشابہات	〃
اوپانی شد کا مرتبہ، اطلاق اور مرتبۂ تشخص	〃
(۲) صفات رحمت و جلال	۱۷۴
(۳) اشتراکی تصورات کا کلی انسداد	۱۷۵
توحید فی الصفات	۱۷۷
مقام نبوت کی حد بندی	〃
(۴) خواص اور عوام دونوں کے لیے ایک تصور	۱۷۸
(۶) اھدنا الصراط المستقیم	۱۸۴
ہدایت	〃
تکوین وجود کے مراتب اربعہ	〃
ہدایت کے ابتدائی تین مرتبے	۱۸۵
ہر مرتبۂ ہدایت ایک خاص حد سے آگے رہنمائی نہیں کرسکتا	۱۸۶
ہر مرتبۂ ہدایت اپنی تصحیح و نگرانی میں بالاتر مرتبۂ ہدایت کا محتاج ہے ۔	
ہدایت فطرت کا چوتھا مرتبہ	۱۸۷
الھدیٰ	۱۸۹
وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم	〃
دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات	۱۹۰
جمعیت بشری کی ابتدائی وحدت، پھر اختلاف اور ہدایت	〃
وحی کا ظہور	〃
عموم ہدایت	〃
نسل انسانی کے ابتدائی عہد اور خدا کے رسول	۱۹۱

عدلِ الٰہی اور بعثتِ رسل	۱۹۱
بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا اور بعض کا نہیں کیا گیا	″
بے شمار قومیں اور بے شمار رسول	″
ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی۔	۱۹۲
سب نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم دی۔	″
قرآن کی تحدی کہ اس حقیقت کے خلاف کوئی مذہبی تعلیم اور روایت پیش نہیں کی جا سکتی	۱۹۳
تمام مقدس کتابوں کی باہم دگر تصدیق اور اس سے قرآن کا استدلال	۱۹۴
"الدین" اور "الشرع"	″
ادیان کا اختلاف	″
اختلاف دین میں نہیں ہوا، شرع و منہاج میں ہوا، اور یہ ناگزیر تھا۔	۱۹۵
تحویلِ قبلہ کا معاملہ اور قرآن کا اعلانِ حقیقت	″
قرآن کے نزدیک دین کے اعتقاد و عمل کی اصل باتیں کیا کیا ہیں؟	۱۹۶
خدا کی حکمت اسکی مقتضی ہوئی کہ اختلاف شرائع ظہور میں آئے۔	۱۹۷
پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت بھلا دی اور شرع کے اختلاف کو باعثِ نزاع بنا لیا۔	″
"تشیع" اور "تحزب" کی گمراہی اور "تجدید دعوت" کی ضرورت	۱۹۸
"تشیع" و "تحزب" کی حقیقت	″
اس بارے میں دعوتِ قرآنی کی تین جہات	۲۰۰
یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی اور اسکا رد	۲۰۱
سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے۔	۲۰۲
عبادت گاہوں میں تفرقہ	″
یہودی اپنے آپ کو نجات یافتہ اُمت سمجھتے تھے اور کہتے تھے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کر دی گئی ہے	۲۰۳
قانونِ نجات کا اعلان عام	۲۰۴
یہودی سمجھتے تھے غیر مذہب والوں کے ساتھ معاملت میں دیانتداری ضروری نہیں، قرآن کا اس کے پر انکار	″
حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت سے استشہاد	۲۰۵
اصل دین وحدت و اخوت ہے نہ کہ تفرقہ و منافرت	۲۰۶
رسم اصطباغ	۲۰۷
قانونِ عمل	″
قرآن کی دعوت	۲۰۸
سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس دعوت کا اصل اصول ہے	۲۰۹
تفریق بین الرسل	″
خدا کی سچائی اس کی عالمگیر بخشش ہے	۲۱۰
راہیں صرف دو ہیں، ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو	″
انکار کی یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا رد کر دو۔	″
جب سب ایک خدا کے پرستار ہیں اور سب کو اپنے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے تو پھر دین کے نام پر نزاع کیوں ہو؟	۲۱۱ ۲۱۲
قرآن کا پیروانِ مذاہب سے مطالبہ	″
اصطلاح قرآنی میں "المعروف" اور "المنکر"	۲۱۳
"الدین القیم" اور "فطرت اللہ"	۲۱۴
"الاسلام"	۲۱۵
قرآن اور اس کے مخالفوں میں بنائے نزاع	۲۱۷
پیروانِ مذاہب کی مخالفت اسلئے نہ تھی کہ جھٹلانا کیوں ہے؟ بلکہ اس لیے کہ جھٹلانا کیوں نہیں؟	۲۱۸
تین اصول جو قرآن اور اس کے مخالفوں میں بنائے نزاع ہوئے۔	۲۱۸
خلاصۂ بحث	۲۱۸
صراطِ مستقیم	۲۲۱
"المغضوب علیہم" اور "الضالین"	۲۲۴
قرآن کے قصص اور استقرائے تاریخی	۲۲۵
سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح	″

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اُمّ القرآن

یعنی

تفسیر سُورہ فاتحہ

(۱)

سُورت کی اہمیّت اور خصوصیّات

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے :۔ جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحہ ہی میں قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے :۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ (۱۵ : ۸۷)

اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآنِ عظیم۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں سات دہرائی جانے والی چیزوں سے مقصود یہی سورت ہے۔ کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو سبع المثانی بھی کہتے ہیں۔ ؎۱

؎۱ امام بخاری اور اصحاب سُنن نے ابوسعید بن المعلّی سے روایت کی ہے :۔ الحمد للہ رب العٰلمین، ھی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیتہ۔ اور امام مالک، ترمذی اور حاکم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت (صلعم) نے ابی ابن کعبؓ کو سُورہ فاتحہ تلقین کی اور یہی الفاظ فرمائے اسی طرح طبری نے حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعود وغیرہم سے روایت کی ہے کہ السبع المثانی فاتحۃ الکتاب۔ ابن مسعودؓ کی اسناد منقطع ہے لیکن ابن عباس کی حسن ہے۔ ابو العالیہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ ان کے علاوہ ائمۂ تابعین کی ایک بڑی جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تمام روایات جمع کر دی ہیں + (شرح کتاب التفسیر جلد ۸۔ صفحہ ۱۲۰۔ طبع اوّل)

احادیث و آثار میں اس کے دوسرے نام بھی آئے ہیں۔ جن سے اس کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اُمّ القرآن الکافیہ، الکنز، اساس القرآن[1]۔

عربی میں "اُمّ" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں" یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں، یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو۔ جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصّے کو اُمّ الرّاس کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو اُمّ کہتے ہیں۔ کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکّہ کو اُمّ القریٰ کہتے تھے۔ کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی پس اس سورت کو اُمّ القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالبِ قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے، یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔

اساسُ القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہدِ نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے اُبّی بن کعب کو یہ سورت تلقین کی اور فرمایا، اس کے مثل کوئی سورت نہیں۔ ایک دوسری میں اُسے "سب سے بڑی سورت" اور "سب سے بہتر سورت" بھی فرمایا ہے[2]۔

سورۂ فاتحہ میں دینِ حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصّے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلّق پیدا ہو گیا ہے، یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دینِ حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں، سورۂ فاتحہ میں انہی کا بہ شکلِ اجمالی بیان موجود ہے۔ اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے۔ جب بھی وہ دینِ حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا، اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

علاوہ بریں جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے اور اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصّل بیانات کا ایک مختصر اور سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بہ آسانی ذہن نشین کر لے، اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دہراتا رہے، یہ اس دینی زندگی کا دستور العمل، خدا پرستی کے عقائد کا خلاصہ، اور رُوحانی تصوّرات کا نصب العین ہوگا، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سورت کا ذکر کرتے ہوئے سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ کہہ کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی ہمیشہ دہرائے جانے اور ورد رکھنے ہی میں اس کے نزول کی حکمت پوشیدہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نادان اور اَن پڑھ ہو، لیکن ان چار سطروں کو یاد کر لینا اور ان کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ لینا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھ سکا۔ جب بھی اس نے دینِ حق کا بنیادی سبق حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے اس سورت کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہُوا

---

[1] صحیح بخاری، موطا، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مسند میں باختلافِ الفاظ اس مضمون کی روایات موجود ہیں ۱۲

[2] یہ سعید بن معلّیٰ کی روایت میں جس کی تخریج پچھلے حاشیہ میں گذر چکی ہے اسے اعظم سورۃ فی القرآن فرمایا ہے۔ اور مسندی روایت ابن جابر میں خیر کا لفظ ہے ۱۲

اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہو سکی، کہ لا صَلٰوۃَ اِلّا بِفَاتِحَۃِ الکتاب (صحیحین) اور اسی لئے صحابۂ کرام اسے سُورۃُ الصلوٰۃ کے نام سے پکارتے تھے یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے، مزید معرفت و بصیرت کا ذریعہ ہوگا لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہو سکتی ؛

دینِ حق کا ماحصل

دینِ حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر غور کیا جائے گا، ان چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دے گی :-

(۱) خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور، اس لئے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں ؛

(۲) قانونِ مجازات کا اعتقاد۔ یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں۔ نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے۔ بُرے کا بُرائی ؛

(۳) معاد کا یقین۔ یعنی انسان کی زندگی اِسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے، اور اجزاء کا معاملہ پیش آنے والا ہے ؛

(۴) فلاح و سعادت کی راہ اور اس کی پہچان ؛

سورۂ فاتحہ کا اسلوبِ بیان

اب غور کرو، ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے! ایک طرف زیادہ سے زیادہ مختصر، حتّیٰ کہ گنے ہوئے الفاظ ہیں۔ دوسری طرف ایسے نچے تُلے الفاظ کہ ان کے معانی سے پوری وضاحت اور دل نشینی پیدا ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی نہایت سیدھا سادہ بیان ہے۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہیں۔ کسی طرح کا الجھاؤ نہیں ؛

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے۔ اُتنی ہی زیادہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے، بناوٹ اور تکلّف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچّی اور حقیقی ہوگی، ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دل نشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے۔ تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ وہ اس طرح قبول کر لے، گویا پیشتر سے ہی سمجھی بُوجھی ہوئی بات تھی۔ اُردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

دیکھنا تقریر کی لذت، کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اب غور کرو، جہاں تک انسان کی خدا پرستی اور خدا پرستی کے تصوّرات کا تعلق ہے، اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور پھر اس سے زیادہ سہل اور دل نشین اسلوبِ بیان کیا ہو سکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں، ہر بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں اور ہر لفظ، صاف اور دل نشین معانی کا نگینہ ہے، جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کر کے اُن صفتوں سے پکارا گیا ہے، جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ اپنی جہالت و غفلت کی وجہ سے اُن میں غور و تفکّر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار ہے۔ اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے۔ اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ لگ چلنے کی طلبگاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں، اور صدیوں سے اس کے مطالب نوعِ انسانی کے سامنے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے دینی تصوّرات کی ایک بہت ہی معمولی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دُنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابلِ حل بات بھی [illegible] دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے۔ جب تک سامنے نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ

مشکل بات کوئی نہیں۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرائے میں بیان کی ہے:-

ہر کس نشناسندۂ رازست، دگرنہ
اینہا ہمہ رازست کہ معلومِ عوام ست!

دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے۔ اُس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھا دی ہوں، کیوں کہ خداپرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جاسکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتادے اور یہی سورۂ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔ اس سورت نے نوعِ انسانی کے وجدانی تصوّرات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیئے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ، اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمودار ہوگیا اور چونکہ یہ تعبیر حقیقتِ حال کی سچّی تعبیر ہے۔ اس لئے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا، بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اس کا ہر بول اور ہر لفظ اس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے!

دینِ حق کی مہمّات

پھر دیکھو، اگرچہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خداپرست انسان کی سیدھی سادی دعا ہے، لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دینِ حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہوگیا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کر رہے ہیں!

(۱) خدا کے تصوّر کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اس تصوّر کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنالیتا تھا۔ سُورہ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کردیا!

اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ حمد ثناءِ جمیل کو کہتے ہیں۔ یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناءِ جمیل اسی کی کی جاسکتی ہے۔ جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصوّر جمع نہیں ہوسکتا۔ جو ذات محمود ہوگی وہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔

پھر حمد کے بعد خدا کی عالمگیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے۔ اور اس طرح صفاتِ الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے۔ جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشوؤ ارتقاء کے لئے ضرورت ہے، اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کردیتی ہے جو اس راہ میں اُسے پیش آسکتی ہیں۔

(۲) رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں خدا کی عالمگیر ربوبیّت کا اعتراف ہے۔ جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشۂ وجود کے لئے ہے اور اس لئے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کردیتا ہے۔ جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہوگئی تھیں اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لئے ہیں کسی دوسری قوم کا ان میں حصّہ نہیں۔

(۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں "اَلدِّیْن" کا لفظ جزاء کے قانون کا اعتراف ہے، اور جزاء کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کرکے یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ جزاء انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو، کیونکہ "الدین" کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔

(۴) ربوبیّت اور رحمت کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْن" کے وصف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کردی کہ اگر کائنات میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ پروردگارِ عالم میں غضب و انتقام ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لئے اس کا ایک خاصّہ اور نتیجہ مقرّر کردیا ہے، عدل و منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عینِ رحمت ہے۔

(۵) عبادت کے لئے یہ نہیں کہا کہ نَعْبُدُكَ بلکہ کہا اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ تیری عبادت کرتے

ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا" صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں" اور پھر اس کے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر استعانت کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔ اِس اسلوبِ بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیئے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں!

(۶) سعادت و فلاح کی راہ کو صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمُ یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا۔ جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو۔ اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو۔

(۷) پھر اس کے لئے ایک سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بتا دی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے۔ یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے۔ کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی زمانہ، کوئی فرد ہو، لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے، ایک ناکام انسانوں کی۔ پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لئے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف اُنگلی اُٹھا دی جائے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا، ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا:۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لئے دُعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اگر تعلیم و امر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا، تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔ دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے۔ صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہیئے؟ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سرجوش ہے جو ایک طالبِ صادق کی زبان پر بے اختیار اُبل پڑتا ہے!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

حمد عربی میں حمد کے معنی ثناءِ جمیل کے ہیں۔ یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بُری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ حمد نہ ہوگی۔ حمد پر الف لام ہے۔ یہ استغراق کے لئے بھی ہو سکتا ہے جنس کے لئے بھی پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہوئے کہ حمد و ثنا میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ سب اللہ کے لئے ہے۔ کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے۔ سب اُسی سے ہے اور اسی میں ہے۔ اور اگر حُسن موجود ہے تو نگاہِ عشق کیوں نہ ہو، اور اگر محبوبیت جلوہ افروز ہے۔ تو زبانِ حمد و ستائش کیوں خاموش رہے؟

آئینہ ما روئے ترا عکس پذیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانبِ ما نیست

حمد سے سُورت کی ابتدا کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ معرفتِ الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے۔ یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اُس کے فکر و وجدان پر طاری ہوگی، وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

انسان کے لئے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، صرف ایک ہی راہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ کائناتِ خلقت میں تفکّر و تدبّر کرے۔ مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع تک پہنچا دے گا۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳: ۱۸۸) اب فرض کرو، ایک طالبِ صادق اس راہ میں قدم اٹھاتا ہے۔ اور کائناتِ خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے، تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا۔ وہ کیا ہوگا؟ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانعِ حکیم اور مدبّر قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرۂ خلقت میں صاف نظر آ رہا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی روح جوشِ ستائش اور محویتِ جمال سے معمور ہو جائے گی۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ! ساری حمد و ستائش اسی کے لئے ہے جو اپنی کارفرمائی کے ہر گوشے میں سرچشمۂ رحمت و فیضان اور منبعِ حسن و کمال ہے!

اس راہ میں فکرِ انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جائیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر بے خود ہو جاتا۔ مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمالِ صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا اعتراف اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائناتِ ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانعِ حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے، اس لئے حسن و جمال کے لئے جتنی بھی شیفتگی ہوگی، خوبی و کمال کے لئے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی، بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا، مصنوع و مخلوق کے لئے نہیں ہوگا۔ صانع و خالق ہی کے لئے ہوگا:۔

عباراتُنا شتّٰی وحُسنُکَ واحدٌ
وکُلٌّ الٰی ذاکَ الجمالِ یشیرُ!

اللہ نزولِ قرآن سے پہلے عربی میں اللّٰہ کا لفظ خدا کے لئے بطورِ اسم ذات کے مستعمل تھا، جیسا کہ شعراءِ جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے، یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسم ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی:-

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (۷: ۱۷۹) — اور اللہ کے لئے حُسن و خوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں)، پس چاہیئے کہ اُسے اُن صفتوں کے ساتھ پکارو!

قرآن نے یہ لفظ محض اس لئے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضیٰ یہی تھا، یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوعِ انسانی کے دینی تصوّرات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بہ تدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہوگئے۔ اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصوّر سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصوّر بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا۔ اور اس لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہو گئے۔ وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا۔ جس کے ذریعہ اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے، جو معبودیت کے معنی میں مستعمل رہی ہے۔ اور عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصّہ پایا جاتا ہے، یہ الف، لام اور ہ کا مادّہ ہے، اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے، کلدانی و سریانی کا "الاہیا" عبرانی کا "الوہ" اور عربی کا "اِلٰہ" اسی سے ہے، اور بلاشبہ یہی "اِلٰہ" ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اَللّٰہ ہوگیا ہے۔ اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

لیکن اگر اللّٰہ "اِلٰہ" سے ہے تو "اِلٰہ" کے معنی کیا ہیں؟ علماءِ لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں، مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل "اِلٰہ" ہے۔ اور "اِلٰہ" کے معنی تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے "ولہ" سے ماخوذ بتایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالقِ کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اہم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے، وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا۔ اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس راہ کی ابتداء بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے!

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

اب غور کرو، خدا کی ذات کے لئے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں، اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں سے پکارنا ہے تو بلاشبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں، لیکن اگر صفات

سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ایک متحیر کر دینے والی ذات ہے، اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے، وہ عجز و درماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے؟ فرض کرو، نوع انسانی نے اس وقت تک خدا کی ہستی یا خلقتِ کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے۔ وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی۔ وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا، اور ادراک کا منتہیٰ مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے، عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ "رَبِّ زِدْنِی فِیكَ تَحَیُّرًا" اور حکماء کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ :-

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

چونکہ یہ اسم خدا کے لئے بطور اسمِ ذات کے استعمال میں آیا، اس لئے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہو گیا جن کا خدا کی ذات کے لئے تصوّر کیا جا سکتا ہے، اگر ہم خدا کا تصوّر اس کی کسی صفت کے ساتھ کریں، مثلاً الرّبّ یا الرّحیم کہیں، تو یہ تصوّر ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا۔ یعنی ہمارے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصوّر پیدا ہو جائے گا جس میں ربوبیّت یا رحمت ہے لیکن جب ہم اَللّٰہ کا لفظ بولتے ہیں۔ تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ان تمام صفاتِ حُسن و کمال سے متّصف ہے۔ جو اس کی نسبت بیان کئے گئے ہیں اور جو اس میں ہونے چاہئیں ؛

(۳)

رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ

ربُوبیّت

حمد کے بعد بالترتیب چار صفتیں بیان کی گئی ہیں:- ربّ[1] العٰلمین، الرّحمٰن[2]، الرّحیم[3]، مٰلک یوم الدّین
چونکہ اَلرّحمٰن اور الرّحِیم کا تعلق ایک ہی صفت کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے۔ اس لئے دوسرے لفظوں میں انہیں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ربوبیّت، رحمت، عدالت، تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے ؛

اِلٰہ کی طرح "رب" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادّہ ہے۔ عبرانی، سریانی، اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے۔ اس لئے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ پھر چونکہ مُعلّم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربی" اور "ربّاہ" پرورش کنندہ، معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انہی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے ؛

بہر حال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیئے۔ اسی لئے بعض ائمہ نعمت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:- ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حدّ التمام[1] یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے، اُس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق، اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھُوکے کو کھانا کھلادے، یا محتاج کو روپیہ دیدے تو یہ اس کا کرم ہوگا۔ جُود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیّت کہتے ہیں۔ ربوبیّت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش و نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو، اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں اُن سب کا سر و سامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو، کیوں کہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا، ربوبیّت نہیں ہوسکتا ؛

ربوبیّت کا ایک ناقص نمونہ ہم اُس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا ہے۔ بچّہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے، اور زندگی اور نموّ کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے، سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے، اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیئے، جب تک بچّہ اپنے جسم و ذہن کی حدِّ بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں، اُن کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ

سلہ مفرداتِ راغب اصفہانی ۱۲

اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے۔ حکمتِ الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی، اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریاتِ پرورش کا سروسامان مہیا کرتی رہتی ہے ؛

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا، وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصوّر کیا جاسکتا ہے ؛

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ، اور ربوبیت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصوّر کرو۔ اس کے ربّ العٰلمین ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائناتِ ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے۔ اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے۔ اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے۔ کہ ہر وجود کو زندگی اور بقاء کے لئے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے۔ ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے، اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔ چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے۔ کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں۔ پرند ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ پھول باغ میں کھِل رہے ہیں۔ ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن فطرت کے پاس کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے، اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے، تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی۔ جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلّح[1] آنکھ سے ہم انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لئے سامانِ پرورش مہیا کر دیا ہے ٹھیک ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لئے بھی زندگی اور بقاء کی ہر چیز مہیا کی ہے اور پھر یہ جو کچھ بھی ہے۔ انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے۔ تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے!

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۵۱ : ۲۰ - ۲۱)

ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھتے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

نظامِ ربوبیت

لیکن سامانِ زندگی کی بخشائش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے۔ اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے اگر دنیا میں ایسے عناصر عناصر کی ایسی ترکیب، اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے، جو زندگی اور نشوونما کے لئے سودمند ہے۔ تو محض اس کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ ایسا ہونا قدرتِ الٰہی کی رحمت ہے

---

[1] غیر مسلّح آنکھ NAKED EYE یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو۔ زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔ ۱۲

بخشش ہے، احسان ہے۔ مگر وہ بات نہیں ہے۔ جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، دُنیا میں سُودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں بلکہ جو کچھ بخشتی ہے، ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر وجود کو زندگی اور بقاء کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس وقت، اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح، اُنہی وقتوں میں اور اسی مقدار میں اُسے مل رہی ہے، اور اس نظم و انضباط سے تمام کارخانۂ حیات چل رہا ہے ؎

پانی کی بخشش و تقسیم کا نظام

زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں۔ لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا، تو زندگی کے لئے کافی نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے، کہ پانی موجود ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ترتیب، اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے۔ اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازہ کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے تو یہی ربوبیت ہے اور اسی سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصوّر کرنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا۔ لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی۔ ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کر دیتی ہے!

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۞ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۞ (۲۳: ۱۸-۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ، پانی برسایا پھر اُسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اُسے واپس لے جائیں پھر (دیکھو) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انہی سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہیں۔

تقدیر اشیاء

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا اشیاء کے قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازے کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص قانون کے ماتحت ٹھہرایا ہوا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۖ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۞ (۱۵: ۲۱)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں لیکن (ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں ؎

وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۞ (۱۳: ۸)

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۞ (۵۴: ۴۹)

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازے کیساتھ پیدا کی ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے۔ بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے، یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں، سمندر سے ڈول بھر بھر کر، فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے، تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے، اور اس طرح

برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور اندرونی حصّوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں۔ پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دُور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟

قرآن کہتا ہے: اس لئے کہ کائناتِ ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا۔ مگر یہ ربوبیت ہے جو اُسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہوگئیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُہٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُہٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِہٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖٓ اِذَا ھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

(۳۰ : ۴۸)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں۔ پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

عناصرِ حیات پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زندگی کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، انہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے۔ اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لئے تھی۔ انہی میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے۔ مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔ پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے۔ کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو۔ فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمہارے لئے خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ ہوا کے بعد دوسرے درجہ پر پانی ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اس لئے اس کی بخشائش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے آبِ شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں، پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرمِ کار رہتا ہے۔ وہ سمندر کا شیرا بہ کھینچتا ہے۔ اُسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے۔ پھر حسبِ ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے! پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی، لہٰذا ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دسترخوان کرم بھی خشکی و تری میں بچھا ہوا ہے اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

نظامِ پرورش پھر سامانِ پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو، جو اپنے ہر گوشۂ عمل میں پرورش کی گود اور بخشش حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لئے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لئے ہے کہ روشنی کے لئے چراغ کا اور گرمی کے لئے تنور کا کام دے، اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لئے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں۔ اور کبھی پانی کے ذرّات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں، کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش برسا دیں، زمین اس لئے ہے کہ نشوونما کے خزانوں سے ہمیشہ

معمور رہے اور ہر دانے کے لئے اپنی گود میں زندگی، اور ہر پودے کے لئے اپنے سینہ میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ ہر قوت استعداد ڈھونڈھ رہی ہے۔ اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظام میں ہے۔ جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کار فرمائیاں، فضاء کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے۔ اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵ : ۱۳)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے، سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنیوالے ہیں اس بات میں (معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

نظامِ ربوبیت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت، نظامِ ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سر و سامان، جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے۔ لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالوگے تو صاف نظر آجائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے۔ اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جاتے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں؟ لیکن اگر ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگاؤگے تو دیکھ لوگے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لئے پیدائش ہے۔ اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے۔ سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے۔ پھر طفولیت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ درخت کے مولودِ نباتی کے لئے بھی طفولیت ہے۔ اور تمہاری چشم ظاہر بین کے لئے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو لیکن پتھر کی چٹان اور مٹی کا تودہ بھی اپنی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ پھر طفولیت رُشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامانِ پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سِنِّ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب سِنِّ کمال تک پہنچ گیا۔ تو از سرِ نو ضعف و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لئے ایک ہی ہے۔ کسی دائرے میں اُسے مر جانا کہتے ہیں، کسی میں مُرجھا جانا۔ اور کسی میں پامال ہو جانا۔ الفاظ متعدد ہو گئے مگر حقیقت میں تعدّد نہیں ہوا:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ
جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ
بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ط يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ج
وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (۳۰ : ۵۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے۔ پیدا کرتا ہے، وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً
فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ
بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطٰمًا ط

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں پھر اُن کی نشو و نما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں، پھر ترقی کے بعد

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ○
(۳۹ : ۲۱)

زوال طاری ہوا اور، تم دیکھتے ہو کہ ان پہ زردی چھا گئی۔ پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئی۔ بلاشبہ دانشمندوں کے لئے اس صورت حال میں بڑی ہی عبرت ہے!

جہاں تک غذا کا تعلق ہے۔ حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے۔ جن کے بچے دُودھ سے پرورش پاتے ہیں، اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں، غور کرو، نظامِ ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لئے کیسا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے؟ دُودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے۔ جونہی وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں، مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے۔ اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے۔ جو حالتِ طفولیت میں اس کے لئے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوشِ محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے۔ اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے! پھر دیکھو، اس کی غذا نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے؟ ابتداء میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دُودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ دُودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے۔ اور مائیت کے مقابلہ میں دُہنیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بچے کا عہدِ رضاعت پورا ہو جاتا ہے۔ اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے جونہی اس کا وقت آتا ہے۔ ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ربوبیتِ الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے دُودھ کی ضرورت نہیں رہی۔ ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔

وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا
(۴۶ : ۱۵)

اور حمل اور دُودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تین مہینوں کی۔

پھر ربُوبیتِ الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے اور کس طرح اس جذبے کو طبیعتِ بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر بنا دیا گیا ہے؟ دنیا کی کون سی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جسے ماں کی ممتا کہتے ہیں؟ جس بچے کی پیدائش اس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی:۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا
(۴۶ : ۱۵)

اُس کی ماں نے اُسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔

اُسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ سنِّ بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا وہ اپنے لئے نہیں بلکہ بچے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں۔ جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اُسے گریز ہو۔ حُبِّ ذات جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی، وہ بھی اس جذبۂ خود فراموشی کے مقابلہ میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی، فطرتِ مادری کا ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے۔ اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن دیکھو کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے۔ کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ محبت

مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب حیوانات میں تو بالکل ہی بُجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے۔ کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آجائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے؟ اس لئے کہ یہ نظامِ ربوبیت کی کار فرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو۔ اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبۂ محبت میں رکھ دیا تھا۔ جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں کے لئے بوجھ اور بچے کے لئے رکاوٹ ہوتا۔ بچے کی احتیاج کا سب سے زیادہ نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی اس لئے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا، احتیاج کم ہوتی گئی۔ اس لئے محبت کی گرمجوشیاں بھی گھٹتی گئیں۔ فطرت نے محبت مادری کا دامن بچے کی احتیاجِ پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی تو محبت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی۔ جب احتیاج کم ہو گئی تو محبت بھی تغافل کرنے لگی[15]۔

جن حیوانات کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی جسمانی ساخت اور طبیعت دُودھ والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے، اس لئے وہ اوّل دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کھلانے کے لئے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو؛ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈھنے لگتا ہے اور ماں چُن چُن کر اس کے سامنے ڈالتی اور منہ میں لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے۔ مگر ہضم نہیں کرتی، اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ غذا کے لئے مُنہ کھولتا ہے تو اس کے اندر اتار دیتی ہے۔

ربُوبیت معنوی

پھر اس سے بھی عجیب تر نظامِ ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے۔ کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس کی ہر قوت اس کے سامانِ پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اُسے زندہ رہنے اور نشو و نما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو۔ جو اُس کے حالاتِ پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ و تفکر سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان میں دو باتیں سب سے نمایاں ہیں۔ اس لئے جا بجا قرآنِ حکیم نے اُن پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر

تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے۔ خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر

---

[15] انسان میں ماں کی محبت بلوغ کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے۔ اور بعض حالتوں میں اس کے انفعالات اتنے شدید ہوتے ہیں۔ کہ عہدِ طفولیت کی محبت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن یہ صورتِ حال غالباً انسان کی مدنی و عقلی زندگی کے نشو و نما کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ فطرتِ حیوانی کا ابتدائی انسان میں بھی یہ علاقہ فطرۃً اسی حد تک ہو گا کہ بچہ سنِ تمیز تک پہنچ جائے لیکن بعد کو نسل و خاندان کی تشکیل اور اجتماعی احساسات کی ترقی سے مادری رشتہ ایک دائمی رشتہ بن گیا ۱۲

نہیں جا سکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشو و نما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے :-

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (۲ : ۲۵)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا!

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گرد و پیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسا قانونِ خلقت ہے جو کبھی متغیر نہیں ہو سکتا؟ یہ کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اس کا گرد و پیش ہے۔ اور ہر گرد و پیش ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے۔ یہ اس حکیم و قدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے۔ اور اس نے ہر چیز کی خلقت و زندگی کے لئے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات و نباتات ہی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لئے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظام گردش بھی اسی تقدیر کی حد بندیوں پر قائم ہے :-

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۳۶ : ۳۸)

اور (دیکھو) سورج کے لئے جو قرارگاہ ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے۔ اور یہ عزیز و علیم خدا کی اس کے لئے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گرد و پیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے۔ جس نے دونوں میں باہم دگر مناسبت پیدا کر دی ہے اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے۔ جس میں اس کے لئے پرورش اور نشو و نما کا سامان ہوتا ہے پرند کا جسم اڑنے والا ہے۔ مچھلی کا تیرنے والا۔ چار پایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا، اس لئے کہ ان میں سے ہر نوع کا گرد و پیش ویسے ہی جسم کے لئے موزوں ہے۔ جیسا اسے ملا ہے اور اس لئے کہ ان میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گرد و پیش چاہتی ہے۔ جیسا گرد و پیش اسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ گرد و پیش اس کے لئے مفید پرورش نہیں خشکی میں مچھلیاں پیدا نہیں ہو سکتیں کیونکہ خشکی ان کے لئے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف، ایک خاص گرد و پیش کی مخلوق دوسرے قسم کے گرد و پیش میں چلی جاتی ہے۔ تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی، یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد و پیش میں ہونی چاہیئے ❊

پھر ان میں سے ہر نوع کے لئے مقامی مؤثرات کے مختلف گرد و پیش ہیں اور ہر گرد و پیش کا یہی حال ہے۔ سرد آب و ہوا کی پیداوار، سرد آب و ہوا ہی کے لئے ہے۔ گرم کی گرم کے لئے۔ قطبِ شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خطِ استوا کے قرب میں نظر نہیں آ سکتا اور منطقۂ حارہ کے جانور منطقۂ باردہ میں معدوم ہیں ❊

ہدایت ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی، یہاں صرف اس مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا۔ انہیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے۔ اور اگر ہدایت ربوبیت کی دست گیری نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آ سکتیں ❊

لیکن ربوبیت الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے، وہ کہتا ہے یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے۔ پھر حواس و ادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے، یہ ہدایت کے مختلف مراتب میں سے وجدان اور ادراک

کی ہدایت کے مراتب ہیں ؀

ہدایتِ وجدان وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جونہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان مُنہ میں لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہیئے بلی کے بچوں کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوشِ محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے وہ اس کے سینے پر مُنہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالمِ ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان مُنہ میں لے لینا چاہیئے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے۔ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کرے؟ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وجدانی ہدایت جو قبل اس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے ؀

تمہارے گھر میں پلی ہوئی بلی ضرور ہو گی۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ بلی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اس حالت کا اسے کوئی پچھلا تجربہ حاصل نہیں، تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں، جونہی وضعِ حمل کا وقت قریب آتا ہے خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ مضطرب الحال بلی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچے دیتی ہے۔ پھر یکایک اس کے اندر دیکھتی ہے اور بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے، غور کرو، یہ کون سی قوت ہے جو بلی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے۔ کیوں کہ عنقریب ایسی جگہ کی اسے ضرورت ہو گی؟ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن اور ان کی بُو سونگھتا پھرتا ہے، اس لئے جگہ بدلتے رہنا چاہیئے؟ بلاشبہ یہ ربوبیتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے۔ جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو ان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے ؀

ہدایتِ حواس ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اُس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں۔ جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں احساس و ادراک کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لئے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں، پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لئے ایک ہی طرح کی نہیں ہے۔ بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے۔ جتنی اور جیسی استعداد اس کے حوال و ظروف کے لئے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوتِ شامہ نہایت دور رس ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو۔ تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک، کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانونِ مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی۔ اس لئے کہ خواہ کوئی صورت ہو۔ بہرحال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے۔ اور نشو و نما کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے ؀

چنانچہ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیتِ الٰہی کی وحی سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی مخفی ایماء اور اشارے کے ہیں۔ یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے۔ جو ہر مخلوق پر اس کی راہِ عمل کھول دیتی ہے :-

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ (۱۶ : ۶۸)

اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لئے چھتے بنائے۔

اور یہی وہ ربوبیت الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا : فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ؟ تمہارا پروردگار کون ہے ؟ حضرت موسیٰ نے کہا :-

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ (۲۰ : ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر زندگی و معیشت کی راہ کھول دی!

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ "راہِ عمل آسان کر دینے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے :-

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ۝ (۸۰ : ۱۸—۲۰)

اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا ؟ نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر اس (کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں) کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔ پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی :-

یہی "ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ" یعنی "راہِ عمل آسان کر دینا" وجدان و ادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے کیوں کہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریات زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے بیان کئے ہیں ان میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ، یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے۔ یعنی تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت :-

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (۸۷ : ۲—۳)

وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا۔ پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔ پھر اس پر راہِ (عمل) کھول دی۔

براہین قرآنیہ کا مبدأ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اس کی توحید وصفات پر جابجا نظامِ ربوبیت سے استدلال کیا ہے اور یہ استدلال اس کے مہماتِ دلائل میں سے ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریق استدلال کی بعض مبادیات واضح کر دی جائیں۔ کیونکہ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، مطالبِ قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہو گیا ہے اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو حقیقت گم گشتہ کا سراغ لگایا جائے ؂

دعوتِ تعقل

قرآن کے طریق استدلال کا اولین مبدأ تعقل وتفکر کی دعوت ہے۔ یعنی وہ جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے باہر، جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے اس میں تدبر وتفکر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصہ نہیں، جو تفکر وتعقل کی دعوت سے خالی ہو :-

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۱: ۲۰-۲۱)

اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں (معرفتِ حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

وہ کہتا ہے۔ انسان کو عقل وبصیرت دی گئی ہے، اس لئے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لئے جواب دہ ہے :-

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷: ۳۶)

یقیناً (انسان کا) سننا، دیکھنا، سوچنا سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں!

وہ کہتا ہے زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں، فکرِ انسانی کیلئے معرفتِ حقیقت کی نشانیاں ہیں بشرطیکہ وہ غفلت واغراض میں مبتلا نہ ہو جائے :-

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْہَا وَھُمْ عَنْہَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (۱۲: ۱۰۵)

اور آسمان وزمین میں (معرفتِ حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) لوگ ان پر سے گذر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں!

تخلیق بالحق

اچھا، اگر انسان عقل وبصیرت سے کام لے اور کائناتِ خلقت میں تفکر کرے تو اس پر حقیقت شناسی کا کون سا دروازہ کھلے گا؟ وہ کہتا ہے، سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی وہ تخلیق بالحق کا عالمگیر اور بنیادی قانون ہے یعنی وہ دیکھے گا کہ کائناتِ خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط وترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام وقانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حکمت ومصلحت سے خالی ہو، ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو یعنی بغیر کسی معین اور ٹھہرائے ہوئے مقصد ونظم کے وجود میں آگیا ہو۔

کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس وقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝
(۲۹ : ۴۴)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کیساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لئے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے۔

آلِ عمران کی مشہور آیت میں ان ارباب دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں۔ صدائے حال یہ بتاتی ہے:-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ
(۳۰ : ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تم نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو!

دوسری جگہ، تخلیق بالباطل کو تلعّب سے تعبیر کیا ہے "تلعب" یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدّعا کے کرنا:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
(۴۴ : ۳۸ - ۳۹)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ محض کھیل اور تماشا کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انہیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کیساتھ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

پھر جا بجا اس "تخلیق بالحق" کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر "تخلیق بالحق" کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لئے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع اور راحت ہو:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝
(۳۹ : ۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لئے گردش کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ و فیضان پر توجہ دلائی ہے، اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے:-

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ط مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ط يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝
(۱۰ : ۵)

وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ، وہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔

ایک اور موقع پر فطرت کے جمالی وزیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے یعنی فطرتِ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے۔ جو چاہتا ہے۔ جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس میں حُسن وجمال اور خوبی وکمال ہو:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ

(۶۴ : ۳)

اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت ومصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بنائیں۔

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزاؤسزا کے قانون پر) بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کرتا ہے تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے اور یہ تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور بُرے خواص اور نتائج نہ ہوں، اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں؟ جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے بُرے کا امتیاز رکھتا ہے کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہو جائے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

(۴۵ : ۲۱ - ۲۲)

جو لوگ بُرائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنے دونوں برابر ہو جائیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کے فہم ودانش کا فیصلہ یہی ہے تو) کیا ہی بُرا ان کا فیصلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت ومصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پائے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جابجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لئے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے:۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ (۳۰ : ۸)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار وعبث نہیں بنایا ہے۔ ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

غرضیکہ قرآن کا مبداء استدلال یہ ہے کہ:۔

مبدأ استدلال

(۱) اس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصوّرات موجود تھے وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آ کر ٹھہر گئی تھی لیکن اس نے خدا پرستی کے لئے عقلی تصوّر پیدا کیا:۔

(۲) اس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقل و تفکر پر ہے اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائنات خلقت کے ساتھ مطالعہ و تفکر کی دعوت دیتا ہے ؛

(۳) وہ کہتا ہے کائناتِ خلقت کے مطالعۂ و تفکر سے انسان پر "تخلیق بالحق" کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آتی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے ؛

(۴) وہ کہتا ہے جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کرے گا۔ تو عرفانِ حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی اور جہل و کوری کی گمراہیوں سے نجات پا جائے گا ؛

بُرہانِ ربُوبیت

چنانچہ اس سلسلے میں اس نے مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال ربوبیت کا استدلال ہے اور اسی لئے ہم اسے برہانِ ربوبیت سے تعبیر کر سکتے ہیں وہ کہتا ہے کائنات کے تمام اعمال و مظاہرہ کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے۔ اور پھر ایک ایسے نظامِ ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگار عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آسکتا تھا ؛

وہ کہتا ہے کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ نظامِ ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری، اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو مگر کوئی پروردگار کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الکٹرون کے خواص ہیں جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے؟ اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے مگر کوئی پروردگار موجود نہیں! کارسازی موجود ہے مگر کوئی کارساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم موجود نہیں! حکمت موجود ہے مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے، نہیں۔ انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے۔ جس میں یقین و ایمان ڈھل سکتا ہے۔ شک و انکار کی اس میں سمائی نہیں!

قرآن کہتا ہے، یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظامِ ربوبیت کا مطالعہ کرے اور ایک رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اُٹھے۔ وہ کہتا ہے، ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کر دے سکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے۔ لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جب

اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کونسا اعتقاد ہویا ہوتا ہے۔ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات کی شکلیں ترتیب دے اور پھر اس پر بحث و تقریر کرکے مخاطب کو رد و تسلیم پر مجبور کرے۔ اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لئے دلیلیں پیش کی جائیں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو محض ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کر دے بلکہ ایسی ہونی چاہیئے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات مدعا کے لئے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہوگی خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے:-

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ ۝
(۷۵ : ۱۴)

بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

اور اسی لئے جابجا فطرتِ انسانی کو مخاطب کرتا اور اس کی گہرائیوں سے جواب طلب کرتا ہے:-

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝
(۱۰ : ۳۰)

وہ کون ہے جو آسمان (میں پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونیوالے سامانِ رزق) سے تمہیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور پھر وہ کونسی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار) بول اٹھیں گے "اللہ" ہے (اس کے سوا کون ہو سکتا ہے)، اچھا تم ان سے کہو، جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ وافسوس تمہاری سمجھ پر تم (حقیقت سے منہ پھیرے) کہاں جا رہے ہو؟

اور دوسرے موقع پر فرمایا:-

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا، پھر اس آب پاشی سے خوشنما باغ اگا دیئے۔ حالانکہ تمہارے

ذَاتَ بَهْجَةٍ ج مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا ج ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ ۝ أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ط ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ط أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ط ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ أَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ط ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۲۰ : ۶۱ – ۶۴)

بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اُگاتے کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی دُوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر، حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ لوگ وہ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے!

اچھا، بتلاؤ وہ کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں۔ اس کی درستگی کے لئے پہاڑ بلند کر دیئے، دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں)، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ افسوس! (کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے!

اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا دُکھ درد ٹال دیتا ہے؟ اور وہ کہ اس نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمہاری غفلت پر) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

اچھا، بتلاؤ) وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کون ہے۔ جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں!) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں!

اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے، اور پھر اسے دُہراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانے رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر!) ان سے کہو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو (اور انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو!

1ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ اور وہ فطرت انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے۔ ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی۔ اس لئے قرآن کا اسلوبِ استدلال، ان پر واضح نہ ہو سکا۔ اور وہ دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہرحال قرآن کے وہ بے شمار مقامات، جن میں کائناتِ ہستی کے سروسامانِ پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں:-

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال میں آتی رہتی ہے): ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں۔ پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی، ترکاریاں، زیتون کا تیل: درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس کے لئے)، تمہارے فائدے کے لئے، اور تمہارے جانوروں کے لئے!

(۸۰ : ۲۴ - ۳۲)

ان آیات میں فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے۔ لیکن دلائلِ حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکیں۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف آنکھیں بند کر لے۔ لیکن بہرحال اپنی شب و روز کی قدر کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا؟ جو غذا اس کے سامنے دھری ہے۔ اسی پر نظر ڈالے، یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے اچھا گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لیکر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا۔ اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظامِ ربوبیت موجود ہے۔ تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

سورۂ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہے:-

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ۝ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۝ ثُمَّ كُلِي مِنْ

اور (دیکھو یہ) چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے لئے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی بڑی عبرت ہے؛ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں۔ جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا، دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو؛ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کیلئے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!

اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی حقیقت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کر دی جاتی ہیں اپنے چھتے گھر بنائے۔ پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل

كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

(۱۶ : ۶۶ - ۶۹)

فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے۔ جس میں انسان کے لئے شفا ہے۔ بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے!

جس طرح اس نے جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لئے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو۔ اسی طرح وہ ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو۔ اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہوسکتا جو خود پرورده اور محتاج پروردگاری ہو۔ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں۔ جیسا کہ سورۂ واقعہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں:-

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ أَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ۝

اچھا، تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو، اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لئے رہ جاؤ کہ افسوس ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑیگا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں ہی سے محروم ہوگئے!

اچھا، تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے میں آتا ہے، اسے کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو، یا تم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کردیں۔ پھر کیا اس نعمت کے لئے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو تو اس کے لئے لکڑی تم نے پیدا کی ہے۔ یا ہم پیدا کر رہے ہیں؟

ف۱ اس موقع پر یہ اصل پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر واعتبار کے مختلف پہلو رکھتی ہے اسی طرح قرآن کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے البتہ خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً شہد کی پیدائش اور شہد کی مکھی کے اعمال کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ بات کہ ایک نہایت مفید اور لذیذ غذا پیدا ہو جاتی ہے، ربوبیت ہے۔ یہ بات کہ ایک حقیر سا جانور اس دانشمندی و دقت کے ساتھ یہ کام انجام دیتا ہے، ذہن و ادراک کی بخشش کا عجیب و غریب منظر ہے اور اس لئے حکمت و قدرت کا پہلو رکھتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ ربوبیت پر دلائی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی حکمت و قدرت کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ رہی ہے، اس طرح اکثر مقامات ہیں ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کے مشترک مظاہر بیان کئے گئے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو پر ہے۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۚ

(۵۶ : ۶۳ تا ۷۳)

نظامِ ربوبیت سے توحید پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت سے توحید الٰہی پر استدلال کرتا ہے جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے۔ اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(۲ : ۲۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اس پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اس لئے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔ وہ پروردگارِ عالم جس نے تمہارے لئے زمین فرش کی طرح بچھا دی، اور آسمان چھت کی طرح بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کر دیئے تاکہ تمہارے لئے رزق کا سامان ہو۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیت ہے اور ربوبیت اسی کی ربوبیت تو) ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلہ ٹھہراؤ، اور تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو!

یا مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝

(۳۵ : ۳)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمہیں فیض یاب کیا ہے، ان پر غور کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمہیں زمین و آسمان کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں، کوئی معبود نہیں ہے۔ مگر اسی کی ایک ذات!

نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جس رب العالمین نے تمہاری پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اس نے تمہاری روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں، اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیوں کر ممکن ہے۔ کہ جسم کی نشو و نما کے لئے تو اس کے پاس سب کچھ ہو۔ لیکن روح کی نشو و نما کے لئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو؟

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرہ کے لئے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لئے کارسازی رکھتی ہے تو کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لئے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لئے آسمان سے پانی برسائے

لیکن ارواح کی پرورش کے لئے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے ؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مُردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرّے کو مالا مال کر دیتی ہے پھر کیا ضروری ہے کہ جب عالمِ انسانیت ہدایت وسعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کہ ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچادے روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے ؟ وہ کہتا ہے وحی الٰہی ہے تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا او اور مُردہ زمین زندہ ہوگئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اُٹھو کہ وحی الٰہی ظاہر ہوئی ، اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہوگئی ؟

حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ
اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّ فِی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ
لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَفِیْ خَلْقِکُمْ
وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ
لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۙ وَاخْتِلَافِ
الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ
السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِھَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ
لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ
نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ
حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝
(۴۵ : ۱ - ۶)

یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔ بلاشبہ ایمان رکھنے والوں کے لئے آسمانوں اور زمین میں (معرفتِ حق کی) بے شمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمہاری پیدائش میں، اور ان چارپایوں میں جنہیں اس نے زمین میں پھیلا رکھا ہے۔ اربابِ یقین کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں، اور اس سرمایۂ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا ہے اور زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور ہواؤں کے ردّ و بدل میں اربابِ دانش کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں (اے پیغمبر!) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات رہ گئی ہے جسے سن کر یہ لوگ ایمان لائیں گے ؟

سورۂ انعام میں ان لوگوں کا جو وحی الٰہی کے نزول پر متعجب ہوتے ہیں۔ ان لفظوں میں ذکر کیا ہے :-

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ اِذْ
قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ
مِّنْ شَیْءٍ ؕ (۶ : ۹۱)

اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی، یقیناً انہوں نے نہیں کی جب انہوں نے یہ کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی"

تو پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسبِ ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ
یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ
الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ
فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ۝ فَالِقُ
الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیْلَ
سَکَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
حُسْبَانًا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ
الْعَلِیْمِ ۝ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ

یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے، (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے، ہاں، وہی تمہارا خدا ہے، پھر تم اس سے روگردانی کر کے کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو، ہاں وہی (پردۂ شب چاک) کرکے صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے وہی ہے جس نے رات کو راحت وسکون کا ذریعہ بنا دیا ، اور وہی ہے کہ چاند اور سورج کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم

لَکُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط قَدْ
فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ہ الخ
(۶-۹۵-۹۹)

کر دی کہ حساب کا معیار بن گئی - یہ اس عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے اور پھر دیکھو) وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے پیدا کر دیئے تاکہ خشکی و تری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی پاؤ۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں۔ ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں!

یعنی جس پروردگار عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ تمام فیضان شب و روز دیکھ رہے ہو کیا ممکن ہے کہ وہ تمہاری جسمانی پرورش و ہدایت کے لئے تو یہ سب کچھ کرے۔ لیکن تمہاری روحانی پرورش و ہدایت کے لئے اس کے پاس کوئی سروسامان نہ ہو؛ وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے۔ پھر کیا تمہاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے دیگا؛ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی و تری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ کیوں کر ممکن ہے کہ تمہاری روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی روشنی نہ ہو، جو تم کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں۔ کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو خدا کی وحی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے نازل ہو رہی ہے؛ اگر تمہیں تعجب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اس کی صفتوں میں اس طرح نہیں دیکھا ہے۔ جس طرح دیکھنا چاہیئے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آجاتی ہے کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لئے یہ پورا کارخانۂ حیات سرگرم رکھے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے سلسلۂ وحی و تنزیل قائم ہو!

نظامِ ربوبیّت سے وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ اعمالِ ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق اور اس کے تمام سلسلۂ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی اور معنوی نشو و نما کے لئے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے ہی بنایا گیا ہو اور کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ اور پھر اگر خالقِ کائنات رب ہے اور کامل درجے کی ربوبیت رکھتا ہے تو کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردۂ ہستی کو محض اس لئے بنایا ہو۔ کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا
وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ہ
فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِکُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ ہ
(۲۳ : ۱۱۵–۱۱۶)

کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائناتِ ہستی کا حقیقی حکمران ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے، کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرشِ بزرگ کا پروردگار ہے!

ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے۔ لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرایہ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وجودِ انسانی کرۂ ارضی کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے اور اگر پیدائشِ حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشوؤ ارتقاء کی تاریخ ہوگی گویا فطرت نے لاکھوں

کروڑوں برس کی کارفرمائی وصناعی سے کرۂ ارضی پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے وہ انسان ہے!

ماضی کے ایک نقطۂ بعید کا تصوّر کرو جب ہمارا یہ کرّۂ سورج کے ملتہب کرّے سے الگ ہوا تھا نہیں معلوم کتنی مدّت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گذر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو ونما پا سکیں اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو ونما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولیں مبیج وجود میں آسکا جسے پروٹو پلازم (PROTOPLASM) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر حیاتِ عضوی کے نشو ونما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گذر گئی کہ اس دَور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلےٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں۔ یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے۔ کہ یہ سلسلہ ارتقاء وجود انسانی تک مرتفع ہو۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طول طویل مدت اس پر گذر گئی۔ بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہوسکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدن اور عقیل انسان ہے!

گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے، وہ تمام تر انسان کی پیدائش وتکمیل ہی کی سرگذشت ہے!

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لئے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے، کیا یہ سب کچھ صرف اس لئے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیے اور مرکر فنا ہو جائے؟ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ!

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وجودِ حیوانی اپنے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے۔ تو مستقبل میں بھی یہ تغیّر وارتقاء کیوں جاری نہ رہے اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں تھیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے!

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ
سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً
مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً
فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝

(۷۵ : ۳۶)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا (اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی؟) کیا اس پر یہ حالت نہیں گذر جائے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی سی شکل ہوگئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا، پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا!

سورۂ ذاریات میں تمام تر دین یعنی جزا کا بیان ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ اور پھر اس پر اعمالِ ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے موثرات سے استشہاد کیا گیا ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ پھر آسمان اور زمین کی بخشایشوں پر اور خود وجود انسانی کی اندرونی، شہادتوں پر توجہ دلائی ہے: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ

آسمان وزمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان وزمین کے پروردگار کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ بلاشبہ وہ معاملہ

تَنْطِقُوْنَ ۝ (یعنی جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح
(۵۱ : ۲۳) یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔

اس آیت میں اثباتِ جزا کے لئے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے۔ لیکن ربّ کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے۔ عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگارِ عالم کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے۔ وہی ربوبیّت کی شہادت ہے۔ اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے اور اس لئے پروردگار بھی موجود ہے تو ممکن نہیں کہ جزا، کا معاملہ بھی موجود نہ ہو اور وہ کسی نتیجہ کے انسان کو چھوڑ دے۔ چوں کہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی۔ اس لئے اس آیت میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعین نہ کر سکے ؂

قرآن حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا طریقہ نہیں ہے۔ جس کے لئے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اثباتِ مدعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں بلکہ وہ ہمیشہ براہِ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوبِ بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لئے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بولا جاتا ہے کہ اس کی تعبیر ہی میں اس کی دلیل بھی موجود ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک واضح مثال یہی صفت ربوبیّت کا جا بجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہو! اسے ربّ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو یہ بات کہ وہ ربّ ہے اور یہ واقعہ ہے۔ کہ اس کی ربوبیّت تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور خود تمہارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے۔ پھر کیوں کر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اس کی ہستی سے انکار کرو؟ وہ ربّ ہے اور ربّ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ جو تمہاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو؟

چنانچہ قرآن کے وہ تمام مقامات جہاں اس طرح کے مخاطبات ہیں کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ۝ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۝ إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ، إِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ، قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ، وغیرہا، تو انہیں مجرد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ خطاب و دلیل دونوں ہیں کیونکہ ربّ کے لفظ نے برہانِ ربوبیّت کی طرف خود بخود رہنمائی کر دی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مفسروں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی۔ کیونکہ منطقی استدلال کے استغراق نے انہیں قرآن کے طریقِ استدلال سے بے پروا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر میں قرآن کے اسلوبِ بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہو سکی اور استدلال کا پہلو طرح طرح توجیہات میں گم ہو گیا ؂

(۴)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرّحمٰن اور الرّحیم

"الرَّحْمٰن" اور "الرَّحِیْم" دونوں رحم سے ہیں۔ عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقت و نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لئے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آ جائے، پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل احسان سب کا مفہوم داخل ہے اور مجرد محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے ؂

اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فَعْلان کا باب عموماً ایسے صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں۔ جیسے پیاسے کے لئے عَطْشَان۔ غضب ناک کے لئے غَضْبَان۔ سراسیمہ کے لئے حَیْرَان، مست کے لئے سکران لیکن فَعِیْل کے وزن میں صفاتِ قائمہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسے صفات کے لئے بولا جاتا ہے۔ جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں، مثلاً کَرِیْم کرم کرنے والا، عَظِیْم بڑائی رکھنے والا عَلِیْم علم رکھنے والا، حَکِیْم حکمت رکھنے والا پس الرَّحْمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے، اور الرَّحِیْم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمام کائناتِ خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے ؂

رحمت کے دو الگ الگ اسموں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس لئے قرآن خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت، رحمت ہی کی صفت ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ تمام تر رحمت ہی ہے :-

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ط   اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے!

(۷ : ۱۵۵)

پس ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی، دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں، یعنی اس میں رحمت ہے کیونکہ وہ الرَّحْمٰن ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے کیونکہ الرَّحْمٰن کے ساتھ وہ الرَّحِیْم بھی ہے!

رحمت

لیکن اللہ کی رحمت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا ظہور ہے۔

جب ہم کائنات ہستی کے اعمال و مظاہر پر غور کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ اس کا نظام ربوبیت ہے۔ کیوں کہ فطرت سے ہماری پہلی شناسائی ربوبیت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب علم و ادراک کی راہ میں چند قدم آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ربوبیت سے بھی ایک زیادہ ع اور عام حقیقت کارفرما ہے اور خود ربوبیت بھی اس کے فیضان کا ایک گوشہ ہے

ربوبیت اور اس کا نظام کیا ہے؟ کائناتِ ہستی کی پرورش ہے۔ لیکن کائناتِ ہستی میں صرف پرورش ہی نہیں ہے۔ پرورش سے بھی ایک زیادہ بناتے، سنوارتے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے۔ اس کے بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال ہے۔ اس کے افعال میں خواص ہیں، اس کی صورت میں حسن ہے اس کی صداؤں میں نغمہ ہے اس کی بُو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر و درستگی کے لئے مفید نہ ہو۔ پس یہ حقیقت جو اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیت سے بھی زیادہ وسیع اور عام ہے، قرآن کہتا ہے کہ رحمت ہے اور خالق کائنات کی رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہے!

تعمیر و تحسین کائنات رحمتِ الٰہی کا نتیجہ ہے

زندگی اور حرکت کا یہ عالمگیر کارخانہ وجود ہی میں نہ آتا۔ اگر اپنے ہر فعل میں بننے بنانے، سنورنے سنوارنے اور ہر طرح بہتر و اصلح ہونے کا خاصہ نہ رکھتا۔ فطرتِ کائنات میں یہ خاصہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ بناؤ ہو، بگاڑ نہ ہو، درستگی ہو، برہمی نہ ہو لیکن کیوں ایسا ہوا کہ فطرت بنائے اور سنوارے، بگاڑے اور الجھائے نہیں۔ یہ کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ درست اور بہتر ہی ہوتا ہے۔ خراب اور بدتر نہیں ہوتا؟ انسان کے علم و دانش کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں۔ فلسفہ و نظر کا قدم جب کبھی اس حد تک پہنچا، دم بخود ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے، یہ اس لئے ہے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور خرابی نہ ہو!

انسان کے علم و دانش کی کاوشیں بتلاتی ہیں کہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ اور سنوار عناصر اولیہ کی ترکیب اور ترکیب کے اعتدال و تسویہ کا نتیجہ ہے، مادہ عالم کی کمیت میں بھی اعتدال ہے۔ کیفیت میں بھی اعتدال ہے یہی اعتدال ہے جس سے سب کچھ بنتا ہے اور جو کچھ بنتا ہے خوبی اور کمال کے ساتھ بنتا ہے۔ یہی اعتدال و تناسب دنیا کے تمام تعمیری اور ایجابی حقائق کی اصل ہے۔ وجود، زندگی، تندرستی، حسن، خوشبو، نغمہ، بناؤ اور خوبی کے بہت سے نام ہیں۔ مگر حقیقت ایک ہی ہے اور وہ اعتدال ہے۔

لیکن فطرتِ کائنات میں یہ اعتدال و تناسب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہوا کہ عناصر کے دقائق جب ملیں تو اعتدال و تناسب کے ساتھ ملیں اور مادہ کا خاصہ یہی ٹھہرا کہ اعتدال و تناسب ہو، انحراف اور تجاوز نہ ہو؟ انسان کا علم دم بخود اور متحیر ہے لیکن قرآن کہتا ہے یہ اس لئے ہوا کہ خالق کائنات میں رحمت ہے اور اس لئے کہ اس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے اور جس میں رحمت ہو اور اس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہوگا اس میں خوبی و بہتری ہی ہوگی، حسن و جمال ہی ہوگا، اعتدال و تناسب ہی ہوگا اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا!

فلسفہ ہمیں بتلاتا ہے کہ تعمیر اور تحسین فطرتِ کائنات کا خاصہ ہے۔ خاصۂ تعمیر چاہتا ہے کہ بناؤ ہو، خاصۂ تحسین چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے خوبی و کمال کے ساتھ بنے اور یہ دونوں خاصے "قانون" ضرورت کا نتیجہ ہیں۔ کائنات ہستی کے ظہور و تکمیل کے لئے ضرورت تھی کہ تعمیر ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ تعمیر ہو، حسن و خوبی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہی "ضرورت" بجائے خود ایک علت ہو گئی اور اس لئے فطرت سے جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہونا ضروری تھا۔

لیکن اس تعلیل سے بھی تو یہ عقدہ حل نہیں ہوا؟ سوال جس منزل میں تھا اس سے صرف ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ تم کہتے ہو، یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس لئے ہے کہ "ضرورت" کا قانون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ "ضرورت" کا قانون کیوں موجود ہے؟ کیوں یہ ضروری ہوا کہ جو کچھ ظہور میں آئے "ضرورت" کے مطابق ہو؟ اور ضرورت اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور

بر ہی نہ ہو ؟ انسانی علم کی کاوشیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ ایک مشہور فلسفی کے لفظوں میں: "جس جگہ سے یہ کیوں شروع ہو جائے سمجھ جاؤ کہ فلسفہ کے غور و خوض کی سرحد ختم ہو گئی" لیکن قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ "ضرورت" رحمت اور فضل کی ضرورت ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے بہتر ہو اور نافع ہو۔ اور اس کے جو کچھ ظہور میں آتا ہے، بہتر ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے!

پھر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دنیا میں زندگی اور بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے جمال و زیبائی ان سے ایک زائد تر فیضان ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ قانونِ ضرورت ہی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت، زندگی اور بقا کا سرو سامان چاہتی ہے لیکن زندہ اور باقی رہنے کے لئے جمال و زیبائش کی کیا ضرورت ہے، اگر جمال و زیبائش بھی موجود ہے تو یقیناً یہ فطرت کا ایک مزید لطف و احسان ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صرف زندگی ہی نہیں بخشتی بلکہ زندگی کو حسین و لطیف بھی بنانا چاہتی ہے۔ پس یہ محض زندگی کی ضرورت کا قانون نہیں ہو سکتا۔ یہ اس ضرورت سے کوئی بالاتر "ضرورت" ہے جو چاہتی ہے کہ مرحمت اور فیضان ہو۔ قرآن کہتا ہے یہ رحمت کی "ضرورت" ہے اور رحمت کا مقتضی یہی ہے کہ وہ سب کچھ ظہور میں آئے جو رحمت سے ظہور میں آنا چاہیئے:-

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ (۶ : ۱۲)	آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کے لئے ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے۔ اللہ کے لئے ہے۔ جس نے اپنے لئے ضروری ٹھہرا لیا ہے۔ کہ رحمت ہو۔
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (۷ : ۱۵۶)	اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے!

افادہ وفیضانِ فطرت

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے وہ کائنات ہستی اور اس کی تمام اشیاء کا افادہ و فیضان ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت کے تمام کاموں میں، کامل نظم و یکسانیت کے ساتھ مفید اور بکار آمد ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ اور اگر بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ تمام کارگاہ عالم صرف اسی لئے بنا ہے کہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور ہماری حاجت روائیوں کا ذریعہ ہو:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵ : ۱۳)	اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو، کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اس بات میں (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں![1]

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں جو کچھ بھی موجود ہے اور جو کچھ ظہور میں آتا ہے۔ اس میں سے ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے۔ اور ہر حادثہ کی کوئی نہ کوئی تاثیر ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمام خواص و مؤثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ہر خاصہ ہماری ضرورت پوری کرتا، اور ہر تاثیر ہمارے لئے کوئی نہ کوئی فیضان رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ، سب کے خواص و فوائد ہیں۔ اور سب ہمارے لئے طرح طرح کی راحتوں اور آسائشوں کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں:

[1] صفحہ [illegible] پر دیکھیں

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ
بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ج
وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی
الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ ج وَسَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْھٰرَ ۚ
وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ج
وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ ۚ
وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ ط
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا
تُحْصُوْھَا ط اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ۔

(۱۴ : ۳۲)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل تمہاری غذا کے لئے پیدا کر دیئے۔ اس طرح اس نے یہ بات بھی ٹھہرا دی کہ سمندر میں جہاز تمہارے لئے زیر فرمان رہتے اور حکم الٰہی سے چلتے رہتے ہیں اور اسی طرح دریا بھی تمہاری کاربراریوں کے لئے مسخر کر دیئے گئے اور (پھر اتنا ہی نہیں بلکہ غور کرو تو) سورج اور چاند بھی تمہارے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں کہ ایک خاص ڈھنگ پر گردش میں ہیں۔ (اور رات اور دن کا اختلاف بھی (تمہارے فائدہ ہی کے لئے) مسخر ہے۔ غرضیکہ جو کچھ تمہیں مطلوب تھا وہ سب کچھ اس نے عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے!

زمین کو دیکھو، اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں گہرائی سے چاندی سونا نکل رہا ہے۔ وہ اپنی جسامت میں اگرچہ مدور ہے۔ لیکن اس کا ہر حصہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک مسطح فرش بچھا دیا گیا ہے!

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین اس طرح بنادی

ؔلہ اس آیت میں اور اس کی تمام ہم معنی آیات میں "سخر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی گئی ہیں، عربی میں تسخیر ٹھیک ٹھیک اسی معنی میں بولا جاتا ہے جس معنی میں ہم اردو میں بولا کرتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کا "قہرا و جبرا" اس طرح مطیع ہو جانا کہ جس طرح چاہیں اس سے کام لیں، غور کرو انسانی قوا کی عظمت و سروری کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ موزوں تعبیر اور کیا ہو سکتی تھی؟ قرآن کے نزول سے پہلے اقوام عالم کی دینی ذہنیت انسان کی عقلی امنگوں کے قطعاً خلاف تھی۔ لیکن قرآن نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس کی عقلی امنگوں کی جرأت افزائی کر دی بلکہ اس کی ہمت عقل اور اولوالعزمی علم کے لئے ایک ایسی بلند نظری کا نقشہ کھینچ دیا۔ جس سے بہتر نقشہ آج بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے۔ سب اس لئے ہے کہ انسان کے آگے مسخر ہو کر رہے اور انسان ان میں تصرف کرے، انسانی عقل و فکر کے لئے اس سے زیادہ بلند نصب العین اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر غور کرو "تسخیر" کا لفظ انسانی عقل کی حکمرانیوں کے لئے کس درجہ موزوں لفظ ہے؟ اس تسخیر کا قدیم منظریہ تھا کہ انسان کا چھوٹا سا بچہ لکڑی کے دو گز تختے جوڑ کر سمندر کے سینے پر سوار ہو جاتا تھا اور نیا منظریہ ہے کہ آگ، پانی، ہوا، بجلی تمام عناصر پر حکمرانی کر رہا ہے!

البتہ یہ بات یاد رہے کہ قرآن نے جہاں کہیں اس تسخیر کا ذکر کیا ہے۔ اس کا تعلق صرف کرۂ ارضی کی کائنات سے ہے یا آسمان کے ان موثرات سے ہے جنہیں ہم یہاں محسوس کر رہے ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ تمام موجودات ہستی اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں یا تمام موجوداتِ ہستی میں وہ اشرف و اعلیٰ مخلوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری دنیا کائنات ہستی کے بے کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں، (وما یعلم جنود ربک الا ھو۔ اور انسان کو جو کچھ بھی برتری حاصل ہے وہ صرف اسی دنیا کی مخلوقات میں ہے۔ ۱۲

وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (۴۳ : ۱۰)

کہ فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور اس میں قطع مسافت کی (ہموار) راہیں پیدا کر دیں۔

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ
فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِن
كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي
اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

اور یہ اسی پروردگار کی پروردگاری ہے کہ اس نے زمین (تمہاری سکونت کے لئے) پھیلا دی اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اور نہریں بہا دیں، نیز ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کر دیں اور پھر یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ رات اور دن یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور رات کی تاریکی دن کی روشنی ڈھانپ لیتی ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَ
جَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَ
نَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ
صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَ
نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ
فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

(۱۳ : ۳-۴)

اور (پھر دیکھو) زمین کی سطح اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے قریب (آبادی کے) قطعات بن گئے اور انگوروں کے باغ، غلّہ کی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ پیدا ہو گئے۔ ان درختوں میں بعض درخت زیادہ ٹہنیوں والے ہیں، بعض اکہرے اور اگرچہ سب کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے لیکن پھل ایک طرح کے نہیں۔ ہم نے بعض درختوں کو بعض درختوں پر پھلوں کے مزہ میں برتری دے دی۔ بلاشبہ ارباب دانش کے لئے اس میں (معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ
قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝

(۷ : ۹)

اور دیکھو! ہم نے زمین میں تمہیں طاقت و تصرف کے ساتھ جگہ دی، اور زندگی کے تمام سامان پیدا کر دیئے (مگر افسوس)، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نعمت الٰہی کے شکر گزار ہو!

سمندر کی طرف نظر اٹھاؤ اس کی سطح پر جہاز تیر رہے ہیں، تہہ میں مچھلیاں اچھل رہی ہیں، قعر میں مرجان اور موتی نشوونما پا رہے ہیں:۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا
مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۚ وَ
تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ۝ (۱۶ : ۱۳)

اور (دیکھو) یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے سمندر تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ اس کی غذا کے لئے تر و تازہ گوشت حاصل کرو اور زیور کی چیزیں نکالو۔ جنہیں (خوشنمائی کے لئے) پہنتے ہو نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں (جیب) چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور سیر و سیاحت کے ذریعہ اللہ کا فضل تلاش کرو تاکہ اس کی نعمت کے شکر گزار رہو:۔

حیوانات کو دیکھو۔ زمین کے چار پائے، فضا کے پرند، پانی کی مچھلیاں، سب اسی لئے ہیں کہ اپنے اپنے وجود سے ہمیں فائدہ پہنچائیں۔ غذا کے لئے ان کا دودھ اور گوشت، سواری کے لئے ان کی پیٹھ،

حفاظت کے لئے ان کی پاسبانی، پہننے کے لئے ان کی کھال اور اُون، برتنے کے لئے ان کے جسم کی ہڈیاں تک مفید ہیں!

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(۱۶ : ۵ — ۸)

اور چار پائے پیدا کر دیئے جن میں تمہارے لئے جاڑے کا سامان اور طرح طرح کے منافع ہیں اور ان سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ جب ان کے غول شام کو چر کر واپس آتے ہیں اور جب چراگاہوں کے لئے نکلتے ہیں تو دیکھو، ان کے منظر میں تمہارے لئے خوشنمائی رکھ دی ہے اور انہی میں وہ جانور بھی ہیں جو تمہارا بوجھ اٹھا کر ان (دور دراز) کے شہروں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک تم بغیر سخت مشقت کے نہیں پہنچا سکتے تھے بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور صاحب رحمت ہے اور (دیکھو) گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کئے گئے تاکہ تم ان سے سواری کا کام لو اور خوشنمائی کا بھی موجب ہوں، وہ اسی طرح (طرح طرح کی چیزیں) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں ۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝

(۱۶ : ۶۶)

اور چار پایوں کے وجود میں تمہارے لئے (فہم و بصیرت کی) بڑی ہی عبرت ہے، انہی جانوروں کے جسم سے ہم خون اور کثافتوں کے درمیان پاک وصاف دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بےغل و غش مشروب ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

(۱۶ : ۸۰)

اور (دیکھو) اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے سکونت کی جگہ بنایا اور (جو لوگ شہروں میں نہیں بستے ان کے لئے ایسا سامان کر دیا کہ) چار پایوں کی کھال کے خیمے بنا دیئے۔ سفر اور اقامت، دونوں حالتوں میں انہیں ہلکا پاتے ہو۔ اسی طرح جانوروں کی اُون، رُوؤں، اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں۔ جن سے ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ پہنچتا ہے۔

ایک انسان کتنی ہی محدود اور غیر متمدن زندگی رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے بےخبر نہیں ہو سکتا کہ اس کا گردوپیش اُسے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ایک لکڑہارا بھی اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا نظر اٹھاتا ہے۔ تو وہ اپنے احساس کے لئے بہتر تعبیر نہ پائے لیکن یہ حقیقت ضرور محسوس کر لیتا ہے۔ وہ جب بیمار ہوتا ہے۔ تو جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا لیتا ہے۔ دھوپ تیز ہوتی ہے۔ تو درختوں کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے، بیکار ہوتا ہے تو پتوں کی سرسبزی اور پھولوں کی خوشنمائی اُسے آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ پھر یہی درخت ہیں جو اپنی شادابی میں اسے پھل بخشتے ہیں، پختگی میں لکڑی کے تختے بن جاتے ہیں۔ کہنگی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک ہی مخلوق بنائی ہے جو اپنے منظر سے نزہت و سرور بخشتی ہے۔ اپنی بو سے ہوا کو معطر کرتی ہے۔ اپنے پھل میں طرح طرح کی غذائیں رکھتی ہے۔ اپنی لکڑی سے سامان تعمیر مہیا کرتی ہے

اور پھر خشک ہو جاتی ہے تو اس کے جلانے سے آگ بھڑکتی، چولھے گرم کرتی، موسم کو معتدل بناتی اور اپنی حرارت سے بے شمار اشیاء کے پکنے، پگھلنے اور تپنے کا ذریعہ بنتی ہے!

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۝ (۳۶ : ۸۰)

(اور دیکھو) وہ کارفرمائے قدرت، جس نے سرسبز درخت سے تمہارے لئے آگ پیدا کر دی۔ اب تم اسی سے (اپنے چولھوں) کی آگ سلگا لیتے ہو۔

اور پھر یہ فوائد ہیں جو تمہیں اپنی جگہ محسوس ہو رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے یہ تمام چیزیں کن کن کاموں اور کن کن مصلحتوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کارفرمائے عالم کارگاہِ ہستی کے بنانے اور سنوارنے کے لئے ان سے کیا کیا کام نہیں لے رہا ہے؟

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ (۷۴ : ۳۱)

اور تمہارا پروردگار (اس کارزارِ ہستی کی کارفرمائیوں کے لئے) جو فوجیں رکھتا ہے۔ ان کا حال اس کے سوا کون جانتا ہے؟

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ فطرت نے کائنات ہستی کے افادہ و فیضان کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا اور ہر مخلوق کی یکساں طور رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے عالی شان محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ تمام کارخانۂ ہستی صرف اسی کی کاربراریوں کے لئے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی اپنے بل میں کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی کاربراریوں کے لئے ہیں اور کون ہے جو اُسے جھٹلانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لئے نہیں ہے کہ اس کے لئے حرارت بہم پہنچائے؟ کیا بارش اس لئے نہیں ہے کہ اس کے لئے رطوبت مہیا کرے؟ کیا ہوا اس لئے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بُو پہنچا دے؟ کیا زمین اس لئے نہیں ہے کہ ہر موسم اور ہر حالت کے مطابق اس کے لئے مقام و منزل بنے؟ دراصل فطرت کی بخشائشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی طریقہ سے، ایک ہی نظام کے ماتحت، ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وجود اپنی جگہ محسوس کر سکتا ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم صرف اسی کی کامجوئیوں اور آسائشوں کے لئے سرگرم کار ہے!

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (۶ : ۳۸)

اور زمین کے تمام جانور اور (پروار) بازوؤں سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی طرح اُمتیں ہیں۔

کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لئے ہے

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ دنیا عالم کون و فساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے اور ہر سمٹنے کے ساتھ بکھر۔ لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی و دل آویزی کا ایک پیکر تیار کر دے۔ اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اس لئے ہے، کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ تم ایک عمارت بناتے ہو لیکن اس کے بنانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں بگڑ گئیں؟ چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں۔ بھٹے اگر نہ سُلگائے جاتے درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے۔ عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا۔ پھر یہ راحت و سکون جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے۔ کس صورتِ حال کا نتیجہ ہے؟ یقیناً اسی شور و شر اور

ہنگامۂ تخریب کا، جو سرو سامان تعمیر کی جد وجہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا۔ اگر تخریب کا یہ شور و شر نہ ہوتا تو عمارت کا عیش و سکون بھی وجود میں نہ آتا۔ پس یہی حال فطرت کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو۔ وہ عمارتِ ہستی کا ایک ایک گوشہ تعمیر کرتی رہتی ہے، وہ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے، وہ اس کی درستگی و خوبی کی حفاظت کے لئے ہر نقصان کا دفعیہ اور ہر فساد کا ازالہ چاہتی۔ تعمیر و درستگی کی یہی سرگرمیاں ہیں جو تمہیں بعض اوقات تخریب و نقصان کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہاں تخریب کب ہے؟ جو کچھ ہے تعمیر ہی تعمیر ہے۔ سمندر میں تلاطم، دریا میں طغیانی، پہاڑوں میں آتش فشانی، جاڑوں میں برف باری، گرمیوں میں سموم، بارش میں ہنگامہ ابر و باد، تمہارے لئے خوش آیند مناظر نہیں ہوتے لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائناتِ ہستی کی تعمیر و درستگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر دنیا کی کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نگاہ میں ہو سکتی ہے۔ اگر سمندر میں طوفان نہ اٹھتے۔ تو میدانوں کو زندگی و شادابی کے لئے ایک قطرہ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اس کُرہ کی تمام سطح پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اٹھوگے، یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہیئے کہ اگر یہ مادہ نہ تو زمین کی قوتِ نشو و نما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کئے ہیں۔ مثلاً سورۂ روم میں ہے:-

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (۳۰ : ۲۴)

اور (دیکھو) اس کی (قدرت و حکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید، دونوں کی حالتیں، طاری ہو جاتی ہیں، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے بلاشبہ اس صورتِ حال میں ان لوگوں کے لئے جو عقل و بینش رکھتے ہیں (حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

جمالِ فطرت

لیکن فطرت کے افادہ و فیضان کی سب سے بڑی بخشائش اس عالمگیر حسن و جمال ہے۔ فطرت نہ بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ اس طرح بناتی سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو، یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رُخ نہیں جس پر حسن و رعنائی نے ایک نقابِ زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضاءِ آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے اجسام اور ان کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں، پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محجوب غرضیکہ تمام تماشاگاہِ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حسن و افروزی و جلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے۔ جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے حسن و زیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے اور کارخانہ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لئے نشاط، سامعہ کے لئے سرور، اور روح کے لئے بہشتِ راحت و سکون بن جائے!

دراصل کائناتِ ہستی کا مایہ خمیر ہی حسن و زیبائی ہے۔ فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ کے لئے مادّی

عناصر پیدا کیے، اسی طرح اس کی خوبروئی و رعنائی کے لیے معنوی عناصر کا بھی رنگ و روغن آراستہ کر دیا۔ روشنی رنگ خوشبو اور نغمۂ حسن و رعنائی کے وہ اجزاء ہیں جن سے مشاطۂ فطرت چہرۂ وجود کی آرائش کر رہی ہے:-

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد!

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ

(۲۷ : ۹۰)

یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز خوبی اور درستگی کے ساتھ بنائی!

ذٰلِکَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (۳۲ : ۶-۷)

یہ اللہ ہے، محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا رحمت والا، جس نے جو چیز بنائی حسن و خوبی کے ساتھ بنائی!

بلبل کی نغمہ سنجی اور زاغ و زغن کا شور و غوغا

بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حسن و خوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو، قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں ہے؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ارغنونِ ہستی کا نغمہ کسی ایک آہنگ ہی سے نہیں بنا ہے اور نہ بننا چاہیے تھا۔ جس طرح تمہارے آلاتِ موسیقی کے پردوں میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح سازِ فطرت کے تاروں میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح سازِ فطرت کے تاروں میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سُر بھی ہیں۔ جن سے باریک اور سُریلی صدائیں نکلتی ہیں۔ موٹے سے موٹے سُر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سُروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہی موسیقی کی حلاوت ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج و تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک ہی سُر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے، اگر تم بین یا ستار اٹھا کر صرف اس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دو گے یا پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگو گے تو یہ نغمہ نہ ہوگا۔ بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز ہو گی۔ یہی حال موسیقیِ فطرت کے زیر و بم کا بھی ہے۔ تمہیں کوّے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی لیکن موسیقیِ فطرت کی تالیف کے لیے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سُر ضروری تھا۔ اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سُر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا اتار سمجھو اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ:-

بر اہلِ ذوق در فیض ورنمی بندد
نوائے بلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو!

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ○

(۱۷ : ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں ہے سب (اپنی بناوٹ کی خوبی اور صنعت کے کمال میں، اللہ کی بڑائی اور پاکی کا (زبانِ حال سے) اعتراف کر رہے ہیں اور (اتنا ہی نہیں بلکہ کائناتِ خلقت میں) کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو (زبانِ حال سے) اس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو، مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل و غفلت سے) اس ترانۂ تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

فطرت کی حسن افروزیاں اور رحمتِ الٰہی کی بخشش

آؤ! چند لمحوں کے لیے پھر ان سوالات پر غور کر لیں جو پہلے گزر چکے ہیں،

فطرت کائنات کی یہ تمام حسن افروزیاں اور جلوہ آرائیاں کیوں ہیں؟ یہ کیوں ہے کہ فطرت حسین ہے اور جو کچھ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ حسن و جمال ہی ہوتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ کارخانۂ ہستی ہوتا۔ لیکن رنگ کی نظر افروزیاں بُو کی عطر بیزیاں، نغمہ کی جاں نوازیاں نہ ہوتیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ سب کچھ ہوتا لیکن سبزۂ گل کی رعنائیاں اور قمری و بلبل کی نغمہ سنجیاں نہ ہوتیں؟ یقیناً دنیا اپنے بننے کے لئے اس کی محتاج نہ تھی کہ تتلی کے پروں میں عجیب و غریب نقش و نگار ہوں اور رنگ برنگ کے دلفریب پرند درختوں کی شاخوں پر چہچہا رہے ہوں؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ درخت ہوتے مگر قامت کی بلندی، پھیلاؤ کی موزونیت، شاخوں کی ترتیب، پتوں کی سبزی، پھولوں کی رنگا رنگی نہ ہوتی، پھر یہ کیوں ہے کہ تمام حیوانات اپنی اپنی حالت اور گرد و پیش کے مطابق ڈیل ڈول کی موزونیت اور اعضاء کا تناسب ضرور ہی رکھیں، اور کوئی وجود نہ ہو جو اپنی شکل و منظر میں ایک خاص طرح معتدل پیمانہ نہ رکھتا ہو؟

انسانی علم و نظر کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں کہ یہاں تعمیر کے ساتھ تحسین کیوں ہے مگر قرآن کہتا ہے یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خالق کائنات اَلرَّحْمٰن اور الرَّحِیْم ہے یعنی اس میں رحمت ہے اور اس کی رحمت اپنا ظہور و فعل بھی رکھتی ہے۔ رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ بخشش ہو، فیضان ہو، جود و احسان ہو۔ پس اس نے ایک طرف تو ہمیں زندگی اور زندگی کے تمام احساس و حواس لطف بخش دیئے، جو خوشنمائی اور بدنمائی میں امتیاز کرتے اور خوبی و جمال سے کیف و سُرور حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف کارگاہِ ہستی کو اپنی حُسن آرائیوں اور جمال فزائیوں سے اس طرح آراستہ کر دیا کہ اس کا ہر گوشہ نگاہ کے لئے جنتِ سامعہ کے لئے حلاوت، اور روح کے لئے سرمایہ کیف و سرور بن گیا!

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (۲۳ : ۱۴)	پس کیا ہی بابرکت ذات ہے اللہ کی بنانے والوں میں سب سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ بنانے والا!

قدرت کا خود رو سامانِ راحت و سرور اور انسان کی ناشکری

ہم زندگی کی بناوٹی اور خود ساختہ آسائشوں میں اس درجہ منہمک ہو گئے ہیں۔ کہ ہمیں قدرتی راحتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور بسا اوقات تو ہم ان کی قدر و قیمت کے اعتراف سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو اس غفلت سے بیدار کر لیں تو معلوم ہو جائے کہ کائناتِ ہستی کا حُسن و جمال فطرت کی ایک عظیم اور بے پایاں بخشش ہے اور اگر یہ نہ ہوتی یا ہم میں اس کا احساس نہ ہوتا تو زندگی، زندگی نہ ہوتی، نہیں معلوم کیا چیز ہو جاتی۔ ممکن ہے موت کی بدحالیوں کا ایک تسلسل ہوتا!

ایک لمحہ کے لئے تصور کرو کہ دنیا موجود ہے مگر حسن و زیبائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے، آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے، ستارے ہیں مگر ان کی درخشندگی و جہاں تابی کی یہ جلوہ آرائی نہیں ہے۔ درخت ہیں مگر بغیر سبزی کے، پھول ہیں مگر بغیر رنگ و بُو کے، اشیاء کا اعتدال، اجسام کا تناسب، صداؤں کا ترنم، روشنی و رنگت کی بو قلمونی، ان میں سے کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی یا یوں کہا جائے کہ ہم میں ان کا احساس نہیں ہے۔ غور کرو، ایک ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کیسا بھیانک اور ہولناک منظر پیش کرتا ہے۔ ایسی زندگی جس میں نہ تو حسن کا احساس ہو نہ حسن کی جلوہ آرائی نہ نگاہ کے لئے سرور ہو، نہ سامعہ کے لئے حلاوت، نہ جذبات کی رِقت ہو نہ محسوسات کی لطافت، یقیناً عذاب و جانکاہی کی ایک ایسی حالت ہوتی جس کا تصور بھی ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے!

لیکن جس قدرت نے ہمیں زندگی دی، اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حسن و زیبائی کی بخشش سے بھی الا مال کر دے۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حُسن کا احساس دیا۔ دوسرے

ہاتھ سے تمام دنیا کو جلوۂ حسن بنا دیا۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں رحمت کی موجودگی کا یقین دلاتی ہے۔ اگر پردۂ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہی ہوتی، رحمت نہ ہوتی یعنی پیدا کرنے یا پیدا ہو جانے کی قوت ہوتی مگر افادہ و فیضان کا ارادہ نہ ہوتا، تو یقیناً کائنات ہستی میں فطرت کے فضل و احسان کا یہ عالمگیر مظاہرہ بھی نہ ہوتا!

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اَسْبَغَ
عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ
بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ
مُّنِیْرٍ ○ (۳۱ : ۲۰)

کیا تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے خدا نے مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام نعمتیں ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی پوری کر دی ہیں، انسانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت ہو، یا کوئی کتاب روشن۔

انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا اس کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا، تم گنگا کے کنارے بستے ہو، اس لئے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے، لیکن اگر یہی پانی چوبیس گھنٹے تک میسر نہ آئے۔ تو تمہیں معلوم ہو جائے۔ اس کی قدر و قیمت کا کیا حال ہے۔ یہی حال فطرت کے فیضانِ جمال کا بھی ہے۔ اس کے عام اور بے پردہ جلوے شب و روز تمہاری نگاہوں کے سامنے سے گذرتے رہتے ہیں۔ اس لئے تمہیں ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ صبح اپنی ساری جلوہ آرائیوں کیساتھ روز آتی ہے اسلئے ہم بستر سے سر اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چاندنی اپنی ساری حسن افروزیوں کے ساتھ ہمیشہ نکھرتی رہتی ہے۔ اس لئے تم کھڑکیاں بند کر کے سو جاتے ہو۔ لیکن جب یہی شب و روز کے جلوہ ہائے فطرت، تمہاری نظروں سے روپوش ہو جاتے ہیں۔ یا تم ان کے نظارہ و سماع کی استعداد باقی نہیں رہتی تو غور کرو۔ اس وقت تمہارے احساسات کا کیا حال ہوتا ہے؛ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر چیز زندگی کی ایک بے بہا برکت اور معیشت کی ایک عظیم الشان نعمت تھی۔ سرد ملکوں کے باشندوں سے پوچھو، جہاں سال کا بڑا حصہ ابر آلود گذرتا ہے۔ کیا سورج کی کرنوں سے بڑھ کر بھی زندگی کی کوئی مسرت ہو سکتی ہے۔ ایک بیمار سے پوچھو جو نقل و حرکت سے محروم بستر مرض پر پڑا ہے۔ وہ بتائے گا کہ آسمان کی صاف اور نیلگون فضا کا ایک نظارہ، راحت و سکون کی کتنی بڑی دولت ہے۔ ایک اندھا جو پیدائشی اندھا نہ تھا، تمہیں بتا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی اور باغ و چمن کی بہار دیکھے بغیر زندگی بسر کرنا کیسی ناقابلِ برداشت مصیبت ہے۔ تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کے لئے ترستے ہو۔ اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ و حشم کی نمائش ہے، لیکن تم بھول جاتے ہو کہ زندگی کی حقیقی مسرتوں کا جو خودرو سامان فطرت نے ہر مخلوق کے لئے پیدا کر رکھا ہے اس سے بڑھ کر دنیا کی دولت و حشمت کونسا سامانِ نشاط مہیا کر سکتی ہے؟ اگر ایک انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو تو پھر اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؛ جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو۔ جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو۔ جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو۔ جس کی بہار سبزۂ و گل سے لدی ہوئی اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گراں بار ہوں۔ جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ و آہنگ رکھتی ہو کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش اور

حیات سے محروم اور نعمتِ معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے؟ کیا کسی آنکھ کے لئے جو دیکھ سکتی ہو اور کسی دماغ کے لئے جو محسوس کر سکتا ہو، ایک ایسی دنیا میں نامرادی و بدبختی کا گلہ جائز ہے؟ قرآن نے جابجا انسان کو اس کے اسی کفرانِ نعمت پر توجہ دلائی ہے:

وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴:۳۴)

اور اس نے تمہیں وہ تمام چیزیں دے دیں جو تمہیں مطلوب تھیں اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنی ہوں تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی شمار نہیں کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف بڑا ہی ناشکرا ہے!

جمالِ معنوی

پھر فطرت کی بخشائشِ جمال کے اس گوشہ پر بھی نظر ڈالو کہ اس نے جس طرح جسم و صورت کو حُسن و زیبائی بخشی، اس طرح اس کی معنویت کو بھی جمالِ معنوی سے آراستہ کر دیا۔ جسم و صورت کا جمال یہ ہے کہ ہر وجود کے ڈیل ڈول اور اعضاء و جوارح میں تناسب ہے۔ معنویت کا جمال یہ ہے کہ ہر چیز کی کیفیت اور باطنی قوٰی میں اعتدال ہے۔ اسی کیفیت کے اعتدال سے خواص اور فوائد پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہی اعتدال ہے جس نے حیوانات میں ادراک و حواس کی قوتیں بیدار کر دیں اور پھر انسان کے درجہ میں پہنچ کر جوہر عقل و فکر کا چراغ روشن کر دیا!

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ
وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۶:۷۸)

اور (دیکھو) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ تم اپنی ماؤں کے شکم سے پیدا ہوتے ہو اور کسی طرح کی سمجھ بوجھ تم میں نہیں ہوتی لیکن اس نے تمہارے لئے دیکھنے سننے کے حواس بنا دیئے اور سوچنے سمجھنے کیلئے عقل دیدی تاکہ اس کی نعمت کے شکر گذار ہو۔

کائناتِ ہستی کے اسرار و غوامض بے شمار ہیں، لیکن روحِ حیوانی کا جوہر ادراک زندگی کا سب سے زیادہ لاینحل عقدہ ہے۔ حیوانات میں کیڑے مکوڑے تک ہر طرح کا احساس و ادراک رکھتے ہیں اور انسانی دماغ کے نہاں خانہ میں عقل و تفکر کا چراغ روشن ہے۔ یہ قوتِ احساس، یہ قوتِ ادراک، یہ قوتِ عقل، کیونکر پیدا ہوئی، مادی عناصر کی ترکیب و امتزاج سے ایک ماورائے مادہ جوہر کس طرح ظہور میں آگیا۔ چیونٹی کو دیکھو اس کے دماغ کا حجم سوئی کی نوک سے شاید ہی کچھ زیادہ ہوگا۔ لیکن مادہ کے اس حقیر ترین عصبی ذرہ میں بھی احساس و ادراک، محنت و استقلال ترتیب و تناسب، نظم و ضبط اور صنعت و اختراع کی ساری قوتیں مخفی ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنے اعمالِ حیات کی کرشمہ سازیوں سے ہم پر رعب اور حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے۔ شہد کی مکھی کی کارفرمائیاں ہر روز تمہاری نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کون ہے جس نے ایک چھوٹی سی مکھی میں تعمیر و تخمین کی ایسی منتظم قوت پیدا کر دیتی ہے؟ قرآن کہتا ہے یہ اس لئے ہے کہ رحمت کا مقتضا جمال تھا۔ اور ضروری تھا کہ جس طرح اس نے جمالِ صوری سے دنیا آراستہ کر دی ہے۔ اسی طرح جمالِ معنوی کی بخشائشوں سے بھی اسے مالا مال کر دیتی!

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْۤ اَحْسَنَ
كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ
الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ

یہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے جس نے جو چیز بھی بنائی، حُسن و خوبی کے ساتھ بنائی چنانچہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ دخون کے، خلاصہ سے جو پانی کا ایک حقیر سا قطرہ ہوتا ہے قائم کر دیا پھر اس کی تمام قوتوں کی درستگی کی اور اپنی روح میں سے

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

(۳۲ : ۶ - ۹)

ایک قوت) پھونک دی اور (اس طرح) اس کے لئے سننے دیکھنے اور فکر کرنے کی قوتیں پیدا کر دیں (لیکن افسوس انسان کی غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ (اللہ کی رحمت کا) شکر گزار ہو!

بقاء انفع

لیکن کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر اس میں خوبی کے بقاء اور خرابی کے ازالے کے لئے ایک اٹل قوت سرگرم کار نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہے؟ فطرت کا انتخاب ہے۔ فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے، وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور بہتری ہی باقی رکھتی ہے۔ فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم اسے "بقاء اصلح" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ "اصلح" یعنی FITTEST لیکن قرآن "بقاء اصلح" کی جگہ "بقاء انفع" کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اس کارگاہ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو۔ کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہے۔ اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو۔ وہ نقصان زیرہی گوارا نہیں کر سکتی۔ تم سونا کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتے ہو، کھوٹ جل جاتا ہے۔ خالص سونا باقی رہ جاتا ہے۔ یہی مثال فطرت کے انتخاب کی ہے۔ کھوٹ میں نفع نہ تھا۔ نابود کر دیا گیا۔ سونے میں نفع تھا، باقی رہ گیا:-

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ
اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ
السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا
يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ
ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ
مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ
الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ
فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ
النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ

(۱۳ : ۱۷)

خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی، اس کے مطابق بہہ نکلے اور جس قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آ گیا تھا سے سیلاب اٹھا کر بہا لے گیا۔ اسی طرح جب زیور یا اور کسی طرح کا سامان بنانے کے لئے (مختلف قسم کی دھاتیں) آگ میں تپاتے ہیں تو اس میں بھی جھاگ اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے جھاگ رائیگاں جائے گا۔ (کیونکہ اس میں نفع نہ تھا) جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہوگا وہ زمین میں باقی رہ جائے گی۔

تدریج و امہال

پھر اگر دقت نظر سے کام لو، تو افادۂ فیضان فطرت کی حقیقت کچھ انہی مظاہر پر موقوف نہیں ہے بلکہ کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال و قوانین کا یہی حال ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ فطرت کے تمام قوانین اپنی نوعیت میں کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اگر لفظوں میں اسے تعبیر کرنا چاہو تو صرف فطرت کے فضل و کرم ہی سے تعبیر کر سکتے ہو نہیں اور کوئی تعبیر نہیں ملے گی۔ مثلاً اس کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ بتدریج کرتی ہے اور اس تدریجی طرز عمل نے دنیا کے لئے مہلت اور ڈھیل کا فائدہ پیدا کر دیا ہے یعنی اس کا ہر قانون فرصتوں پر فرصتیں دیتا ہے اور اس کا ہر فعل عفو و درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے۔ بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں۔ ان میں رد و بدل کا امکان نہیں۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ۔ (۵۰ : ۲۸)

ہمارے یہاں جو بات ایک مرتبہ ٹھہرا دی گئی اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اور اس لئے تم خیال کرنے لگتے ہو کہ ان کی قطعیت بے رحمی سے خالی نہیں لیکن تم نہیں سوچتے کہ جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور بے پروا ہیں، وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگزر اور مہلت بخشی و اصلاح کوشی کی رُوح بھی رکھتے ہیں؟ اسی لئے آیت مندرجہ صدر میں "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ" کے بعد ہی فرمایا:-

وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (۵۰ : ۲۸)

لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ ہم بندوں کے لئے زیادتی کرنے والے ہوں!

فطرت اگر چاہتی تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آ جاتی، یعنی اس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر حالت، ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور و بلوغ کے لئے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز رکھتی ہے۔ اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی رہتی ہے۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی اور کس طرح درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گذرتی ہے۔ اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا اور یکے بعد دیگرے، مختلف منزلیں طے کرتا ہوا، آخری نقطۂ بلوغ تک پہنچا کرتا ہے تم بد پرہیزی کرتے ہو تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہو جاؤ بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہو اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورتِ حال کے لئے یکساں نہیں ہوتی، درجہ بدرجہ اترتے ہوئے، موت کے آغوش میں جا گرتے ہو۔ نباتات کو دیکھو۔ درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتے ہیں یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مُرجھا کر رہ جائیں، یا کھڑے کھڑے اچانک گر جائیں۔ بلکہ بتدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے، اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کر دی گئی ہے۔ یا تو بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں یا بالکل کھوکھلے ہو کر گر پڑتے ہیں۔

اصطلاح قرآنی میں "اجل"

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہے۔ کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا تدریجی دَور نہ رکھتا ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ، ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے۔ یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لئے اس کی "اجل" یعنی مقررہ وقت ہے۔ مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے، اور بعض حالتوں میں اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظام اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو اگر اسے ایک ہزار برس یا پچاس ہزار برس تصور کر لو۔ تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے۔ ان کی مقدار کتنی ہوگی؟

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝
(۲۲ : ۴۷)

اور بلاشبہ تمہارے پروردگار کے حساب میں ایک دن ایسا ہے جیسے تمہارے حساب میں ایک ہزار برس!

تکویر

فطرت کا یہی تدریجی طرزِ عمل ہے جسے قرآن نے "تکویر" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی لپیٹنے سے وہ کہتا ہے بجائے اس کے کہ اچانک دن کی روشنی اُٹھ جائی۔ اور ناگہاں رات کی اندھیری

اُبل پڑتی، فطرت نے رات اور دن کے ظہور کو اس طرح تدریجی بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، رات آہستہ آہستہ دن پر لپٹتی جاتی ہے اور دن درجہ بدرجہ رات پر لپٹتا آتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ج
يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط

(٣٩ : ٥)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹتی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے (ایک خاص انتظام کے ماتحت) مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کیلئے حرکت میں ہیں!

قرآن اس تدریجی رفتارِ عمل کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو و درگذر کرنے اور ایک خاص مدت تک فرصتِ حیات بخشنے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے یہ اس لئے ہے کہ کائناتِ ہستی میں فضل و رحمت کی مشیت کام کر رہی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے، ہر غلطی کو درستگی کے لئے، ہر نقصان کو تلافی کے لئے، ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لئے، زیادہ سے زیادہ مہلتِ اصلاح ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔

تاخیرِ اجل

وہ کہتا ہے اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں اور بخششیں نہ ہوتیں تو دنیا میں وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان، ہر فساد، اچانک بیک دفعہ، بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا:-

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا
كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا
مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ج فَاِذَا جَآءَ
اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ
بَصِيْرًا ۝

(٣٥ : ٤٥)

اور انسان جو کچھ اپنے اعمال سے کمائی کرتا ہے۔ اگر اللہ اس پر فوراً مواخذہ کرتا تو یقین کرو، زمین کی سطح پر ایک جاندار بھی باقی نہ رہتا لیکن (یہ اس کی رحمت ہے کہ) اس نے ایک مقررہ وقت تک فرصتِ حیات دے رکھی ہے البتہ جب وہ مقررہ وقت آ جائے گا تو پھر (یاد رہے کہ) اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت اور ہر حال میں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

تدریج و امہال اچھائی اور برائی دونوں کے لئے ہے

قدرتی طور پر یہ ڈھیل اچھائی اور برائی دونوں کے لئے ہے۔ اچھائی کے لئے اس لئے تاکہ زیادہ نشو و نما پائے۔ برائی کے لئے اس لئے۔ تاکہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کرے:-

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ
مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ
عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

(١٧ : ٢١)

ان لوگوں کو بھی اور ان لوگوں کو بھی (یعنی اچھوں کو بھی اور بروں کو بھی) سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش میں حصہ مل رہا ہے۔ اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں۔

اگر قوانینِ فطرت کی ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھا کر نقصان و فساد کی اصلاح کر لی جائے مثلاً تم نے بدپرہیزی کی تھی۔ اسے ترک کر دو۔ تو پھر اسی فطرت کا یہ بھی قانون ہے کہ اصلاح و تلافی کی

ہر کوشش قبول کر لیتی ہے۔ اور نقصان و فساد کے جو نتائج نشو و نما پانے لگے تھے ان کا مزید نشو و نما فوراً رک جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر اصلاح بر وقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے تو پچھلے مضر اثرات بھی محو ہو جائیں گے، گویا کوئی خرابی پیش ہی نہیں آئی تھی لیکن اگر فطرت کی تمام مہلت بخشیاں رائیگاں گئیں۔ اس کا بار بار اور درجہ بدرجہ انذار بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا تو پھر بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہو جاتی ہے۔ جہاں پہنچ کر فطرت کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اور پھر جب اس کا فیصلہ صادر ہو جائے تو نہ اس میں چشم زدن کی تاخیر ہو سکتی ہے، نہ کسی حال میں بھی تنزلزل اور تبدیلی:-

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ ٥

(۱۶ : ۶۱)

(پھر جب ان کا مقررہ وقت آگیا تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں، یعنی نہ تو اس کے نفاذ میں تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم، ٹھیک ٹھیک اپنے وقت میں وہ سے آجاتا ہے)

تسکینِ حیات

زندگی کی محنتیں اور کاوشیں

یا مثلاً ہم دیکھتے ہیں، انسان کی معیشت، قیام و بقاء کی جد و جہد اور کشاکش کا نام ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے اور بہ حیثیت مجموعی زندگی اضطراری ذمہ داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے:-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ٥

(۹۰ : ۴)

(بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں کی آزمائش ہے:-)

مشغولیت اور انہماک

لیکن با ایں ہمہ، فطرت نے کارخانۂ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کی خواہشیں، ولولے، اور انفعالات ودیعت کر دیئے ہیں کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک عجیب طرح کی وابستگی، مشغولیت، ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہی زندگی کا انہماک ہے جس کی وجہ سے ہر ذی حیات نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کر رہا ہے۔ بلکہ انہی مشقتوں میں زندگی کی بڑی سے بڑی لذت و راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ مشقتیں جس قدر زیادہ ہوتی ہیں۔ اتنی ہی زیادہ زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی ان مشقتوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا اور اب زندہ رہنا اس کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ ہے!

حالات متفاوت ہیں لیکن زندگی کی وابستگی اور سرگرمی سب کے لئے ہے

پھر دیکھو کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ حالات متفاوت ہیں، طبائع متنوع ہیں، اشغال مختلف ہیں، اغراض متضاد ہیں۔ لیکن معیشت کی وابستگی اور سرگرمی سب کے لئے یکساں ہے۔ اور سب ایک ہی طرح اس کی مشغولیتوں کے لئے جوش و طلب رکھتے ہیں۔ مرد و عورت، طفل و جوان، امیر و فقیر، عالم و جاہل، قوی و ضعیف، تندرست و بیمار، مجرد و متاہل، عائلہ و مرضعہ، سب اپنی اپنی حالتوں میں منہمک ہیں اور کوئی نہیں جس کے لئے زندگی کی کاوشوں میں جذبیت نہ ہو۔ امیر اپنے محل کے عیش و نشاط میں اور فقیر اپنی بے سرو

سامانیوں کی فاقہ مستی میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن دونوں کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں دل بستگی ہوتی ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون زیادہ مشغول ہے۔ ایک تاجر جس انہماک کے ساتھ اپنی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا حساب کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مزدور بھی دن بھر کی محنت کے چند پیسے گن لیا کرتا ہے اور دونوں کے لئے یکساں طور پر زندگی محبوب ہوتی ہے۔ ایک حکیم کو دیکھو جو اپنے علم و دانش کی کاوشوں میں غرق ہے۔ اور ایک دہقان کو دیکھو جو دوپہر کی دھوپ میں برہنہ سر ہل جوت رہا ہے اور پھر بتلاؤ۔ کس کے لئے زندگی کی مشغولیتوں میں زیادہ دل بستگی ہے؟

پھر دیکھو بچے کی پیدائش ماں کے لئے کیسی جانکاہی و مصیبت ہوتی ہے؟ اس کی پرورش و نگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طول طویل سلسلہ ہے؟ تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہشوں اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے۔ اور ہر ماں پرورش، اولاد کے لئے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا دکھ سہے گی اور پھر اسی دکھ میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کرے گی۔ وہ جب اپنی معیشت کی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے اور اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے، تو اس کے دل کا ایک ایک ریشہ زندگی کے سب سے بڑے احساسِ مسرّت سے معمور ہو جاتا ہے۔

پھر کاروبار فطرت کے یہ تصرفات دیکھو کہ کس طرح نوع انسانی کے منتشر افراد، اجتماعی زندگی کے بندھنوں سے باہم دگر مربوط کر دیئے گئے ہیں؟ اور کس طرح صلہ رحمی کے رشتہ نے ہر فرد کو سینکڑوں ہزاروں افراد کے ساتھ جوڑ رکھا ہے؟

فرض کرو، زندگی و معیشت ان تمام موثرات سے خالی ہوتی لیکن قرآن کہتا ہے کہ خالی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت کارفرما ہے اور رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ معیشت کی مشقتوں کو خوشگوار بنا دے، اور زندگی کے لئے تسکین و راحت کا سامان پیدا کر دے۔ یہ رحمت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جنہوں نے رنج میں راحت، الم میں لذّت، اور سختیوں میں دل پذیری کی کیفیت پیدا کر دی ہے!

اشیاء و مناظر کا اختلاف و تنوع و تسکینِ حیات

چنانچہ قرآن نے تسکینِ حیات کے مختلف پہلوؤں پر جابجا توجہ دلائی ہے از اں جملہ کائناتِ خلقت کے مناظر و اشیاء کا اختلاف و تنوّع ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اکتاتی ہے۔ اور تبدیلی و تنوع میں خوش گواری و کیفیت محسوس کرتی ہے۔ پس اگر کائناتِ ہستی میں محض یکسانی و یک رنگی ہی ہوتی۔ تو یہ دلچسپی اور خوش گواری پیدا نہ ہو سکتی۔ جو اس کے ہر گوشہ میں ہمیں نظر آ رہی ہے۔ اوقات کا اختلاف، موسموں کا اختلاف، خشکی و تری کا اختلاف مناظرِ طبیعت اور اشیاءِ خلقت کا اختلاف، جہاں بے شمار مصلحتیں اور فوائد رکھتا ہے۔ وہاں ایک بڑی مصلحت دنیا کی زیب و زینت اور معیشت کی تسکین و راحت بھی ہے:-

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوقؔ اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے!

اختلافِ لیل و نہار

چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ رات اور دن کے اختلاف کا ذکر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے اگر غور کرو تو اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں۔ اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ زندگی کے لئے بڑی ہی تسکین و دلبستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر

ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا اگر تم قطبین کے اطراف میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف اپنی نمود نہیں رکھتا تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ اختلاف گزرانِ حیات کے لئے کیسی عظیم الشان نعمت ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (۳ : ۸۷)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب دانش کے لئے (حکمتِ الٰہی) کی بڑی ہی نشانیاں ہیں!

رات اور دن کے اختلاف نے معیشت بنے کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دن کی روشنی جد و جہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی!

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (۵۳ : ۲۸)

اور (دیکھو) یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن (الگ الگ) ٹھہرا دیئے گئے تاکہ رات کے وقت راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبارِ معیشت میں سرگرم ہو)،

دن کی مختلف حالتیں اور رات کی مختلف منزلیں

پھر رات اور دن کا اختلاف، صرف رات اور دن ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گذرتا اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے۔ اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے اور ہر منزل کے سے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے۔ اور اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ دن ڈھلتا ہے اور اس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے۔ اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدل و تجدد کی لذت اور سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝ (۳۰ : ۱۶)

پس پاکی ہے اللہ کے لئے اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لئے ستائش ہے، جب تم پر شام آتی ہے جب تم پر صبح ہوتی ہے۔ جب دن کا آخری وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دوپہر آتی ہے۔

حیوانات کا اختلاف

اسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے اور تمام حیوانات کو دیکھے، فطرت نے کس طرح طرح طرح کے اختلافات سے اس میں تنوع اور دل پذیری پیدا کر دی ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهٗ (۳۵ : ۲۸)

اور انسان، جانور، چارپائے طرح طرح کی رنگتوں کے!

نباتات

عالمِ نباتات کو دیکھو درختوں کے مختلف ڈیل ڈول ہیں۔ مختلف رنگتیں ہیں، مختلف خوشبوئیں ہیں۔ مختلف خواص ہیں۔ اور پھر دانہ اور پھل کھاؤ تو مختلف قسم کے ذائقے ہیں:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ

کیا ان لوگوں نے کبھی زمین پر نظر نہیں ڈالی اور غور نہیں کیا کہ ہم نے نباتات کی ہر دو دو بہتر قسموں میں سے

(۲۶ : ۷)

کتنے (بے شمار) درخت پیدا کر دیئے ہیں!

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝ (۱۶ : ۱۳)

اور (دیکھو) اللہ نے جو پیداوار مختلف رنگتوں کی تمہارے لئے زمین میں پھیلادی ہے۔ سو اس میں بھی عبرت پذیر طبیعتوں کیلئے (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ

(۶ : ۱۴۱)

اور وہ (حکیم و قدیر) جس نے (طرح طرح کے) باغ پیدا کر دیئے۔ ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور طرح طرح کی کھتیاں، جن کے دانے اور پھل کھانے میں مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔

جمادات

حیوانات اور نباتات ہی پر موقوف نہیں۔ جمادات میں بھی یہی قانون فطرت کام کر رہا ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۝ (۳۵ : ۲۷)

اور پہاڑوں کو دیکھو۔ گوناگوں رنگتوں کے ہیں کچھ سفید، کچھ سرخ کچھ کالے کلوٹے!

ہر چیز کے دو دو ہونے کا قانون

اسی قانونِ اختلاف کا ایک گوشہ وہ بھی ہے۔ جسے قرآن نے "تزویج" سے تعبیر کیا ہے اور ہم اسے قانون تثنیہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے یا متقابل و متماثل ہونے کا قانون کائنات خلقت کا کوئی گوشہ بھی دیکھو تمہیں کوئی چیز یہاں اکہری اور طاق نظر نہیں آئے گی۔ ہر چیز میں جُفت اور دو دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر چیز اپنا کوئی مثنیٰ بھی ضرور رکھتی ہے۔ رات کے لئے دن ہے۔ صبح کے لئے شام ہے۔ نر کے لئے مادہ ہے، مرد کے لئے عورت ہے زندگی کے لئے موت ہے[۱]

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

(۵۱ : ۴۹)

اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں!

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ۝

(۳۶ : ۳۶)

پاکی اور بزرگی ہے اس ذات کے لئے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں اور ان تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں، دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں!

---

[۱] قرآن حکیم نے آخرت کے وجود کو جن جن دلائل سے اذعان پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی متقابل وجود یا مثنیٰ ضرور رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لئے بھی کوئی متقابل اور مثنیٰ زندگی ہو۔ دنیوی زندگی کی متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے چنانچہ بعض سورتوں میں انہی متقابل مظاہرات سے استشہاد کیا ہے مثلاً سورۂ والشمس میں فرمایا
وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا الخ (۹۱ : ۱-۶)

مرد اور عورت

یہی قانونِ فطرت ہے جس نے انسان کو دو مختلف جنسوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا اور پھر ان میں فعل و انفعال اور جذب و انجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیے کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت پیدا ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ
الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ
(۴۲ : ۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا۔ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیئے۔

قرآن کہتا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ محبت اور سکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور شراکت سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ
اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا
اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً
وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○
(۳۰ : ۲۱)

اور (دیکھو) اس کی (رحمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی سے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو۔ اور (پھر اس کی یہ کارفرمائی دیکھو کہ) تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

نسب اور صہر

پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد و تناسل کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے اور ہر وجود پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے۔ جو اسے پچھلوں سے جوڑتا ہے۔ دوسری طرف صہر یعنی دامادی کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے آگے آنے والوں سے مربوط کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر وجود کی فردیت ایک وسیع دائرہ کی کثرت میں پھیل گئی ہے۔ اور رشتوں قرابتوں کا ایسا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ
بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ
(۲۵ : ۵۴)

اور وہی (حکیم و قدیر) ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) انسان کو پیدا کیا۔ پھر (اسی رشتۂ پیدائش کے ذریعہ) اسے نسب اور صہر کا رشتہ رکھنے والا بنا دیا!

صلۂ رحمی اور خاندانی حلقہ کی تشکیل

اور پھر دیکھو، اس نسب اور صہر کے رشتے سے کس طرح خاندان اور قبیلہ کا نظام قائم ہو گیا ہے اور کس عجیب و غریب طریقہ سے صلۂ رحمی یعنی قرابت داری کی گہرائیاں ایک وجود کو دوسرے وجود سے جوڑتیں اور معاشرتی زندگی کی باہمی الفتوں اور معاونتوں کے لئے محرک ہوئی ہیں؛ دراصل انسان کی اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ اسی صلۂ رحمی کے سررشتہ نے قائم کر رکھا ہے!

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچو (اور اس کے ٹھہرائے ہوئے رشتوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ) وہ پروردگار جس نے تمہیں ایک فردِ واحد سے پیدا

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝

(۴ : ۱)

کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا)، اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کر دیا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوا لڑکی بھی پیدا ہوئی) پھر ان کی نسل سے ایک بڑی تعداد مرد اور عورت کی پیدا ہو کر پھیل گئی (اس طرح فرد واحد کے رشتہ نے ایک بڑے خاندان اور قبیلہ کی صورت پیدا کر لی۔) پس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے نام پر باہم دگر مہر و شفقت کا سوال کرتے ہو، اور صلۂ رحمی کے توڑنے سے بھی بچو جس کے نام پر باہم دگر ایک دوسرے سے چشم داشت اعانت رکھتے ہو) بلاشبہ اللہ تمہارا نگرانِ حال ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً ۝

(۱۶ : ۷۲)

اور (دیکھو) یہ اللہ ہے جس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑا بنا دیا۔ (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) پھر تمہارے باہمی ازدواج سے بیٹیوں اور پوتوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔

ایامِ حیات کا تغیّر و تنوّع

اسی طرح ایامِ حیات کے تغیّر و تنوّع میں بھی تسکینِ حیات کی ایک بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہر زندگی طفولیت، شباب، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کی مختلف منزلوں سے گذرتی ہے اور ہر منزل اپنے نئے نئے احساسات اور نئی نئی مشغولیتیں اور نئی نئی کاوشیں رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی عالمِ ہستی کی ایک دل چسپ مسافرت بن گئی۔ ایک منزل کی کیفیتوں سے ابھی جی سیر نہیں ہو چکتا کہ دوسری منزل نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح عرصۂ حیات کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی:-

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(۴۰ : ۶۷)

وہ (پروردگار) جس نے تمہارا وجود مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر "علقۃ" سے (یعنی جونک کی شکل کی ایک چیز سے) پھر ایسا ہوتا ہے کہ تم طفولیت کی حالت میں ماں کے شکم سے نکلتے ہو، پھر بڑے ہوتے ہو اور سنِ تمیز تک پہنچتے ہو، اس کے بعد تمہارا جینا اس لئے ہوتا ہے تاکہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچو پھر تم میں سے کوئی تو ان منزلوں سے پہلے ہی مر جاتا ہے کوئی چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اپنے مقررہ وقت تک زندگی بسر کرے۔

زینت و تفاخر، مال و متاع، آل و اولاد

اسی طرح، طرح طرح کی خواہشیں اور جذبے، زینت و تفاخر کے ولولے، مال و متاع کی محبت، آل اولاد کی وابستگیاں زندگی کی دل چسپی اور انہماک کے لئے پیدا کر دی گئی ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (۳ : ۱۴)

انسان کے لئے مرد و عورت کے تعلق ہیں، اولاد ہیں، چاندی سونے کے اندوختوں ہیں، چنے ہوئے گھوڑوں ہیں، مویشیوں ہیں اور کھیتی باڑی ہیں، دل بستگی پیدا کر دی گئی ہے، اور یہ جو کچھ بھی ہے دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔ بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے!

اختلافِ معیشت اور تزاحمِ حیات

اسی طرح معیشت کا اختلاف اور اس کی وجہ سے مختلف درجوں اور حالتوں کا پیدا ہو جانا بھی انہماکِ حیات کا ایک بہت بڑا محرک ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے زندگی میں مزاحمت اور مسابقت کی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس میں لگے رہنے سے زندگی کی مشقتوں کا جھیلنا آسان ہو گیا ہے۔ بلکہ یہی مشقتیں سرتاسر راحت و سرور کا سامان بن گئی ہیں :-

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ
خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ
بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي
مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ
الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۝
(۶ : ۱۶)

اور یہ اسی (حکیم و قدیر) کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں زمین میں (پچھلوں کا) جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر، درجوں میں فوقیت دے دی، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس میں تمہارے عمل کی آزمائش کرے، بلاشبہ تمہارا پروردگار (پاداشِ عمل کی) سزا دینے میں تیز ہے (یعنی اس کا قانون مکافاتِ نتائجِ عمل میں سست رفتار نہیں) لیکن ساتھ ہی بخشش دینے والا رحمت رکھنے والا بھی ہے!

بُرہانِ فضل و رحمت

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے ربوبیت کے اعمال و مظاہر سے استدلال کیا ہے۔ اسی طرح وہ رحمت کے آثار و حقائق سے جابجا استدلال کرتا ہے۔ اور برہانِ ربوبیت کی طرح برہانِ فضل و رحمت بھی اس کی دعوت و ارشاد کا ایک عام اسلوبِ خطاب ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ خلقت کی ہر شے میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت و فضل کے مظاہر کا موجود ہونا، قدرتی طور پر انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں کیوں کہ ممکن نہیں فضل و رحمت کی یہ پوری کائنات موجود ہو۔ اور فضل و رحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائناتِ خلقت کے افادۂ و فیضان، زینت و جمال، موزونیت و اعتدال، تسویہ و قوام اور تکمیل و اتقان کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں :-

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ
فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ
الْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ
فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

اور (دیکھو) تمہارا معبود ہی ایک معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات رحمت والی اور اپنی رحمت کی بخششوں سے ہمیشہ فیض یاب کرنے والی! بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور کشتی میں جو انسان کی کاربراریوں کے لئے سمندر میں چلتی ہے۔ اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس (کی آبپاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلا دیئے ہیں۔ نیز ہواؤں کے (مختلف جانب) پھیرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) بندھے ہوئے ہیں۔ عقل رکھنے والوں کے لئے (اللہ کی ہستی اور اس

لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (۲: ۱۶۳-۱۶۴)

کے قوانینِ فضل و رحمت کی، بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اسی طرح اُن مقامات کا مطالعہ کرو جہاں خصوصیت کے ساتھ جمالِ فطرت سے استدلال کیا ہے:۔

اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ کَیۡفَ بَنَیۡنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ۝ وَ الۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَ اَلۡقَیۡنَا فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ ۝ تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ۝ (۵۰: ۶-۸)

کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس طرح ہم نے اسے بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے اور پھر یہ کہ کہیں بھی اس میں شگاف نہیں؟ اور اسی طرح زمین کو دیکھو کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اور پھر کس طرح قسم قسم کی خوبصورت نباتات اُگا دیں؟ ہر اس بندے کے لئے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ اس میں غور کرنے کی بات اور نصیحت کی روشنی ہے!

وَ لَقَدۡ جَعَلۡنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیۡنَ ۝ (۱۵: ۱۶)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان میں ستاروں کی گردش کے لئے) برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لئے ان میں خوشنمائی پیدا کر دی۔

وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ (۶۷: ۵)

اور (دیکھو) ہم نے دنیا کے آسمان (یعنی کرۂ ارضی کی فضا) کو ستاروں کی قندیلوں سے خوش منظر بنا دیا!

وَ لَکُمۡ فِیۡهَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ۝ (۱۶: ۶)

اور (دیکھو) تمہارے لئے چارپایوں کے منظر میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور جب صبح لے جاتے ہو، ایک طرح کا حُسن اور نظر افروزی ہے!

موزونیت و تناسب

جس چیز کو ہم "جمال" کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب یہی موزونیت اور تناسب ہے۔ جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے۔

وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ۝ (۱۵: ۱۹)

اور (دیکھو) ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اُگائی!

تسویہ

اسی معنی میں قرآن "تسویہ" کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ تسویہ کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح ٹھیک ٹھیک، درست کر دینا کہ اس کی ہر بات خوبی و مناسبت کے ساتھ ہو!

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (۸۷: ۲)

وہ پروردگار، جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر ٹھیک ٹھیک خوبی و مناسبت کے ساتھ درست کر دی۔ اور وہ جس نے ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔ پھر اس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی!

الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ۝ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ۝ (۸۲: ۷)

وہ پروردگار جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا پھر تمہارے ظاہری و باطنی قویٰ میں اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا۔ پھر جیسی صورت بنانی چاہی اسی کے مطابق ترکیب دے دی۔

اتقان

یعنی حقیقت ہے جسے قرآن نے "اتقان" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتِ ہستی کی ہر چیز کا درستگی واستواری کے ساتھ ہونا کہ کہیں بھی اس میں خلل، نقصان، بے ڈھنگا پن، اور پیچ نیچ، ناہمواری نظر نہیں آسکتی!

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۝ (۲۷ : ۹)

یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز درستگی و استواری کے ساتھ بنائی!

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۝ (۶۷ : ۳)

تم الرحمٰن کی بناوٹ میں (رحمٰن کی بناوٹ میں کیونکہ یہ اس کی رحمت ہی کا ظہور ہے) کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے (اچھا نظر اٹھاؤ اور اس نمائش گاہِ صنعت کا مطالعہ کرو) ایک بار نہیں بار بار دیکھو، کیا تمہیں کہیں کوئی دراز دکھائی دیتی ہے۔ تم اس طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو، تمہاری نگاہ اٹھے گی اور عاجز و درماندہ ہو کر واپس آجائے گی۔ لیکن کوئی نقص نہ نکال سکے گی۔

"فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ" فرمایا۔ یعنی یہ خوبی واتقان اس لئے ہے کہ رحمت رکھنے والے کی کاریگری ہے۔ اور رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ حسن وخوبی ہو۔ اتقان وکمال ہو، نقص اور ناہمواری نہ ہو!

رحمت سے معاد پر استدلال

خدا کی ہستی اور اس کی توحید وصفات کی طرح، آخرت کی زندگی پر بھی وہ رحمت سے استدلال کرتا ہے۔ اگر رحمت کا مقتضا یہ ہوا کہ دنیا میں اس خوبی وکمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو۔ تو کیونکر یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانۂ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لئے کچھ باقی نہ رہے؟

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (۱۷ : ۱۹)

کیا ان لوگوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں۔ یقیناً اس بات سے عاجز نہیں ہو سکتا کہ ان جیسے (آدمی دوبارہ) پیدا کر دے؟ اور یہ کہ ان کے لئے اس نے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہے۔ جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں؟ (افسوس ان کی شقاوت پر!) اس پر بھی ان ظالموں نے اپنے لئے کوئی راہ پسند نہ کی۔ مگر حقیقت سے انکار کرنے کی! (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو، اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو اس حالت میں یقیناً تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے ہاتھ روکے رکھتے (لیکن یہ اللہ ہے جس کے خزائنِ رحمت نہ تو کبھی ختم ہو سکتے ہیں نہ اس کی بخشائشِ رحمت کی کوئی انتہا ہے)

رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے

وہ کہتا ہے جو رحمت کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے. کیونکہ ممکن تھا کہ انسان کی معنوی ہدایت کے لئے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہوتا اور وہ انسان کو نقصان و ہلاکت کے لئے چھوڑ دیتی؟ اگر تم دس گوشوں میں فیضانِ رحمت محسوس کر رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ گیارہویں گوشے میں اس سے انکار کرو. یہی وجہ ہے کہ اس نے جا بجا نزولِ وحی، ترسیلِ کتب اور بعثتِ انبیاءؑ کو رحمت سے تعبیر کیا ہے :-

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ
اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ
بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًاۙ اِلَّا
رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ
كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ○
(۱۷ : ۸۶ – ۸۷)

اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تم پر وحی کے ذریعہ بھیجا گیا ہے اسے اٹھالے جائیں (یعنی سلسلہ تنزیل و وحی باقی نہ رہے) اور پھر تمہیں کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے. لیکن یہ جو سلسلۂ وحی جاری ہے تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے. اور یقین کرو تم پر اس کا بڑا ہی فضل ہے.

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِۙ
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ
فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ○
(۳۶ : ۵ – ۶)

(یہ قرآن) عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کو جن کے آباؤ اجداد (کسی پیغمبر کی زبانی) متنبہ نہیں کئے گئے ہیں اور اس لئے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، تم متنبہ کرو:

تورات و انجیل اور قرآن کی نسبت جا بجا تصریح کی کہ ان کا نزول "رحمت" ہے :-

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا
وَّرَحْمَةًؕ (۱۱ : ۱۷)

اور اس سے پہلے (یعنی قرآن سے پہلے) موسیٰؑ کی کتاب (اُمت کے لئے) پیشوا اور رحمت!

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ
جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی
الصُّدُوْرِۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ
وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا
هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○
(۱۰ : ۵۷)

اے افرادِ نسلِ انسانی! یقیناً یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے موعظت ہے جو تمہارے لئے آگئی ہے. اور ان تمام بیماریوں کے لئے جو انسان کے دل کی بیماریاں ہیں، نسخہ شفا ہے اور رہنمائی اور رحمت ہے. ایمان رکھنے والوں کیلئے (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ یہ جو کچھ ہے اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے. پس چاہیئے کہ (فیض یابی پر) خوش ہو. یہ (اپنی برکتوں میں) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم (زندگی کی کامرانیوں کے لئے) فراہم کرتے ہو!

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى
وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ○
(۴۵ : ۲۰)

یہ (قرآن) لوگوں کے لئے واضح دلیلوں کی روشنی ہے اور ہدایت و رحمت ہے. یقین رکھنے والوں کے لئے!

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا
عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى

کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے. جو انہیں (برابر) سنائی جارہی ہے؛ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں. بلاشبہ

لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹ : ۵۰)

ان کے لئے اس (نشانی) میں سرتاسر رحمت اور فہم و بصیرت ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر اس نے داعیِ اسلام کے ظہور کو بھی فیضانِ رحمت سے تعبیر کیا ہے:-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۱ : ۱۰۷)

(اے پیغمبر) ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے۔ مگر اس لئے کہ تمام جہان کے لئے ہماری رحمت کا ظہور ہے!

انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر "رحمت" سے استدلال اور "بقاءِ انفع"

اسی طرح، وہ "رحمت" کے مادی مظاہر سے انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس "رحمت" کا مقتضا یہ ہوا کہ دنیا میں "بقاءِ انفع" کا قانون نافذ ہے یعنی وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے۔ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسانی اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتی اور نافع اور غیر نافع اعمال میں امتیاز نہ کرتی؛ پس مادیات کی طرح معنویات میں بھی یہ قانون نافذ ہے اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح اپنے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ جس طرح مادیات میں تم دیکھ رہے ہو:

حق اور باطل

اس سلسلہ میں وہ دو لفظ استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل"۔ سورۂ رعد میں جہاں قانون "بقاءِ انفع" کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی کہہ دیا ہے۔ کہ اس بیان سے مقصود "حق" اور "باطل" کی حقیقت واضح کرنی ہے:-

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۚ (۱۳ : ۱۸)

اسی طرح اللہ "حق" اور "باطل" کی ایک مثال بیان کرتا ہے۔

ساتھ ہی مزید تصریح کر دی:-

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۗ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۗ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۝ (۱۳ : ۱۸)

پس (دیکھو) میل کچیل ہے جو جھاگ اٹھتا ہے۔ وہ رائیگاں جاتا ہے کیوں کہ اس میں انسان کے لئے نفع نہ تھا۔ لیکن جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ (اپنے قوانین عمل کی) مثالیں دیتا ہے (سو) جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا۔ ان کے لئے خوبی (و بہتری) ہے اور جن لوگوں نے قبول نہ کیا ان کے لئے (اپنے اعمال بد کا) سختی کے ساتھ حساب دینا ہے۔ اور اگر ان لوگوں کے قبضے میں وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی اس پر اور بڑھا دیں۔ اور بدلہ میں دے کر (نتائج عمل سے) بچنا چاہیں جب بھی نہ بچ سکیں گے!)

عربی میں "حق" کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اہرٹ ہو، اسے حق کہیں گے "باطل" ٹھیک ٹھیک اس کا نقیض ہے۔ ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو۔ ٹل جانے والی مٹ جانے والی؛ باقی نہ رہنے والی۔ چنانچہ خود قرآن میں جا بجا ہے۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ۔ (۸ : ۸)

قانون "قضاء بالحق"

وہ کہتا ہے جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی رہتی ہے جو چیز نافع ہوتی ہے۔ باقی رکھتی ہے۔ جو نافع نہیں ہوتی اسے محو کر دیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک ایسا ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ جو عمل حق ہوگا قائم اور ثبات رہے گا۔ جو باطل ہوگا مٹ جائے گا اور جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے۔ تو بقاء حق کے لئے ہوں نہ کہ باطل کے لئے۔ وہ اسے "قضاء بالحق" سے تعبیر کرتا ہے، یعنی فطرت کا فیصلہ حق، جو باطل کے لئے نہیں ہو سکتا:

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ
وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝
(۴۰ : ۷۸)

پھر جب وہ وقت آگیا کہ حکم الٰہی صادر ہو۔ تو خدا کا فیصلہ حق نافذ ہو گیا اور اس وقت ان لوگوں کے لئے جو سر باطل تھے تباہی ہوئی!

اس نے اس کی تعبیر کے لئے "حق" اور "باطل" کا لفظ اختیار کر کے مجرد تعبیر ہی سے حقیقت کی نوعیت واضح کر دی کیوں کہ حق ایسی چیز کو کہتے ہیں جو ثابت و قائم ہو اور باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ مٹ جانا، قائم و باقی نہ رہنا۔ پس جب وہ کسی بات کے لئے کہتا ہے کہ یہ حق ہے۔ تو یہ صرف دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ دعوے کے ساتھ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ بات حق ہے یعنی نہ ٹلنے والی، نہ ملنے والی بات ہے۔ یہ بات باطل ہے یعنی نہ ٹک سکنے والی، مٹ جانے والی بات ہے۔ پس جو بات اٹل ہو گی اس کا اٹل ہونا کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو بات مٹ جانے والی ہے اس کا مٹنا ہر آنکھ دیکھ لے گی!

اللہ کی صفت بھی "الحق" ہے

چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی "الحق" کی صفت استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہستی سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہے۔ جو ثابت اور اٹل ہو سکتی ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۝ (۲۰ : ۱۱۳)

پس یہ تمہارا پروردگار "الحق"!

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ
(۲۰ : ۱۱۳)

پس کیا ہی بلند درجہ ہے اللہ کا، الملک (یعنی فرمانبردار) الحق (یعنی ثابت)

وحی و تنزیل بھی "الحق" ہے

وحی و تنزیل کو بھی وہ "الحق" کہتا ہے کیوں کہ وہ دنیا کی ایک قائم و ثابت حقیقت ہے جن قوتوں نے اسے مٹانا چاہا تھا وہ خود مٹ گئیں حتیٰ کہ آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں لیکن وحی و تنزیل کی حقیقت ہمیشہ قائم رہی اور آج تک قائم ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى
فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ
بِوَكِيْلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى
اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ

(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے وہ چیز تمہارے لئے آگئی جو "حق" ہے پس اب جس کسی نے سیدھی راہ اختیار کی تو یہ راست روی اس کی بھلائی کے لئے ہے۔ اور جس نے گمراہی اختیار کی تو اس کی گمراہی کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے۔ اور میرا کام تو صرف راہ حق دکھلا دینا ہے، میں تم پر نگہبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں (کہ تم کو پکڑ کے زبردستی راہ پر لگا دوں) اور (اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر

اَللّٰہُ ج وَھُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ ٥
(۱۰ : ۱۰۸ — ۱۰۹)

وحی کی گئی ہے اس کے مطابق چلو اور صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط
(۱۷ : ۱۰۵)

اور (اے پیغمبر!) ہماری طرف سے اس کا (یعنی قرآن کا) نازل ہونا حق ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ نازل بھی ہوا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں "الحق"

اسی طرح جب وہ علامت تعریف کے ساتھ کسی بات کو "الحق" کہتا ہے۔ تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہوتی ہے اور اسی لئے وہ اکثر حالتوں میں صرف "الحق" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ اگر فطرتِ کائنات کا یہ قانون ہے کہ وہ حق و باطل کے نزاع میں "حق" ہی کو باقی رکھتی ہے۔ تو کسی بات کے امر حق ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "حق" ہے۔ یعنی باقی و قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا نفاذ قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کر دے گا۔

نزاع حق و باطل

یہ جو قرآن جابجا اور حق اور باطل کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور پھر بطور اصل اور قاعدہ کے اس پر زور دیتا ہے۔ کہ کامیابی حق کے لئے ہے اور ہزیمت و خسران باطل کے لئے، تو یہ تمام مقامات بھی اسی قانون "قضاء بالحق" کی تصریحات ہیں اور اسی حقیقت کی روشنی میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے:۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ
(۲۱ : ۱۸)

اور ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اسے پاش پاش کر دیتا ہے، اور اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو گیا!

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۱۸)

اور کہہ دو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اور یقیناً باطل نابود ہی ہونے والا تھا!

اللہ کی شہادت

اور پھر حق و صداقت کے لئے یہی اللہ کی وہ شہادت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ تھا۔ اور باطل کا کون پرستار تھا یعنی "قضاء بالحق" کا قانون حق کو ثابت و قائم رکھ کر اور اس کے حریف کو محو و متلاشی کر کے حقیقتِ حال کا اعلان کر دیتا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ج يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥
(۲۹ : ۵۲)

ان لوگوں سے کہہ دو اب کسی اور ردّ و کد کی ضرورت نہیں میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی بس کرتی ہے آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے علم میں ہے پس جو لوگ حق کی جگہ باطل پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کی صداقت کے منکر ہیں۔ تو یقیناً وہی ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں!

ایک دوسرے موقع پر فیصلہ امر کے لئے اسے سب سے بڑی شہادت قرار دیا ہے:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ط

(اے پیغمبر!) کون سی بات سب سے بڑی گواہی ہے؟

قُلِ اللّٰہُ شَہِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ۟ وقف

کہہ دو اللہ کی گواہی (ہی میرے اور تمہارے درمیان (فیصلہ امر کے لئے) گواہی دینے والا ہے!

(۶ : ۱۹)

قضاء بالحق مادیات اور معنویات کا عالمگیر قانون ہے

وہ کہتا ہے، اس قانون سے تم کیوں کر انکار کر سکتے ہو جب کہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ اسی کی کار فرمائیوں پر قائم ہے؟ اگر فطرت کائنات نقصان اور برائی چھانٹتی نہ رہتی اور بقاء و قیام صرف اچھائی اور خوبی کے لئے ہی نہ ہوتا تو ظاہر ہے تمام کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔ جب تم جسمانیات میں اس قانونِ فطرت کا مشاہدہ کر رہے ہو۔ تو معنویات میں تمہیں کیوں انکار ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ

اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے، تو یقین کرو، یہ آسمان و زمین اور جو کوئی اس میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جائے!

(۲۳ : ۱)

"انتظار" اور "تربص"

قرآن میں جہاں کہیں انتظار اور تربص پر زور دیا ہے اور کہا ہے جلدی نہ کرو، انتظار کرو، عنقریب حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مثلاً

قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰ : ۱۰۲) تو اس سے مقصود بھی یہی حقیقت ہے۔

"قضاء بالحق" اور تدریج و امہال

لیکن کیا "قضاء بالحق" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے قرآن کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اور رحمت کا مقتضا یہی ہے کہ ایسا نہ ہو۔ جس "رحمت" کا مقتضا یہ ہوا کہ مادیات میں "تدریج و امہال" کا قانون نافذ ہے۔ اسی رحمت کا مقتضاء یہ ہوا کہ معنویات میں بھی تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے۔ اور عالم مادیات ہو یا معنویات، کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں قانون فطرت ایک ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بد عملیوں کے ساتھ مہلتِ حیات پا سکتی:۔

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ

اور جس طرح انسان فائدے کے لئے جلد باز ہوتا ہے اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا، تو (انسان کی لغزشوں، خطاؤں کا یہ حال ہے کہ، کبھی کا فیصلہ ہو چکتا اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہو جاتا۔

(۱۰ : ۱۲)

"اجل مسمّٰی"

وہ کہتا ہے جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لئے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔

مثلاً فطرت کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لئے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے۔ اور اس کے ظہور و تکمیل کے

لئے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولھے پر رکھو اور فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں۔ نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے:

اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہوگئی اور عملِ حق اور عملِ باطل دونوں کے نتائج کے ظہور کے لئے "تاجیل" یعنی ایک معین وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہوگیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی مقررہ "اجل" یعنی مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہوں گے۔ البتہ حق کے لئے تاجیل اس لئے ہوتی ہے۔ تاکہ اس کی فتح مند قوت نشو و نما پائے اور باطل کے لئے اس لئے ہوتی ہے۔ تاکہ اس کی فنا پذیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس تاجیل کے لئے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے۔ اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص مقتضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لئے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو:-

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝ وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝

(۲۱ : ۱۰۹)

پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو: میں نے تم سب کو یکساں طور پر حقیقتِ حال کی خبر دے دی اور میں نہیں جانتا اعمال بد کے جس نتیجہ کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا وقت قریب ہے یا ابھی دیر ہے۔ جو کچھ علانیہ زبان سے کہا جاتا ہے اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو، خدا کو سب کچھ معلوم ہے۔ اور مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے یہ تاخیر اس لئے ہو تاکہ تمہاری آزمائش کی جائے یا اس لئے کہ ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ اٹھانے کا (مزید) موقع دیا جائے۔

قوانینِ فطرت کا معیارِ اوقات

قرآن کہتا ہے تم اپنی اوقات شماری کے پیمانے سے قوانینِ فطرت کی رفتارِ عمل کا اندازہ نہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرہ عمل تو اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیارِ حساب کی بڑی مدت اس کے لئے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ

(۲۲ : ۴۷ ـ ۴۸)

اور یہ لوگ عذاب کے لئے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے۔ تو وہ کہاں ہے؟) سو یقین کرو، خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسے تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں (عرصۂ دراز تک) ڈھیل دی گئی۔ حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (جب ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو) ہمارا مؤاخذہ نمودار ہو گیا اور ظاہر ہے کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔

استعجال بالعذاب

اِن آیات میں فکرِ انسانی کی جس گمراہی کو "استعجال" بالعذاب سے تعبیر کیا گیا ہے وہ صرف انہی منکرین حق کی گمراہی نہ تھی جو ظہورِ اسلام کے وقت اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے بلکہ ہر زمانہ میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات فطرت کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ شر و فساد میں اور زیادہ نڈر اور جری ہو جاتا ہے اور کہتا ہے، اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لئے ان کے نتائج و عواقب ہیں تو وہ نتائج کہاں ہیں؟ اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہو جاتے؟ قرآن جا بجا منکرین حق کا یہ خیال نقل کرتا ہے اور کہتا ہے۔ اگر کائنات ہستی میں اس حقیقتِ اعلیٰ کا ظہور نہ ہوتا جسے "رحمت" کہتے ہیں۔ تو یقیناً یہ نتائج یکایک اور یہ یک دفعہ ظاہر ہو جاتے اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کا سانس نہ لے سکتا لیکن یہاں سارے ہی قانونوں اور حکمیوں سے بھی بالاتر "رحمت" کا قانون ہے۔ اور اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو بھی زندگی و معیشت کی مہلتیں دے اور توبہ و رجوع اور عفو و درگذر کا دروازہ ہر حال میں باز رکھے۔ فطرتِ کائنات میں اگر یہ "رحمت" نہ ہوتی، تو یقیناً وہ جزاءِ عمل میں جلد باز ہوتی لیکن اس میں رحمت ہے۔ اس لئے نہ تو تو اس کی مہلت بخشیوں کی کوئی حد ہے۔ نہ اس کے عفو و درگذر کے لئے کوئی کنارہ!

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ
عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم
بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ
رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا
يَشْكُرُونَ ۝

(۲۷ : ۷۱ : ۷۲)

اور (اے پیغمبر!) یہ (حقیقت فراموش) کہتے ہیں، اگر تم (نتائج ظلم و طغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے؟ (اور کیوں نہیں ہو چکتی؟) ان سے کہہ دو (گھبراؤ نہیں) جس بات کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آ گیا ہو۔ اور (اے پیغمبر!) تمہارا پروردگار انسان کے لئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے (کہ ہر حال میں اصلاح و تلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن افسوس انسان کی غفلت پر، بیشتر ایسے ہیں کہ اس کے فضل، رحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں!

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ
وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى
لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَأْتِيَنَّهُم
بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

(۲۹ : ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آ چکتا؟) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھہرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آ چکا ہوتا اور (یقین رکھو جب وہ آئیگا تو اس طرح آئیگا کہ) یکایک ان پر آ گرے گا اور انہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا!

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ
مَّعْدُودٍ ۝ (۱۱ : ۱۰۴)

اور (یاد رکھو) اگر ہم اس معاملہ میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لئے اسے تاخیر میں ڈال دیں۔

العاقبۃ للمتقین

وہ کہتا ہے یہاں زندگی و عمل کی مہلتیں سب کے لئے ہیں، کیونکہ "رحمت" کا مقتضا یہی تھا۔ پس اس بات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نتائج اعمال کے قوانین موجود نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ نتیجہ کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ اور آخر کار کون برومند ہوتا ہے:

قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہہ دو کہ دیکھو (اب میرے

إِنِّي عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ (۶ : ۱۳۵)

اور تمہارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے ، تم جو کچھ کر رہے ہو ، اپنی جگہ کئے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں ۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس کے لئے آخر کار کامیاب ٹھکانا ہے ۔ بلاشبہ (یہ اس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاسکتے ؛

قرآن کی وہ تمام آیات جن میں ظلم و کفر کے لئے فلاح و کامیابی کی نفی کی گئی ہے

اس موقع پر یہ قاعدہ بھی معلوم کر لینا چاہئیے کہ قرآن نے جہاں کہیں ظلم و فساد اور فسق و کفر وغیرہ اعمالِ بد کے لئے کامیابی و فلاح کی نفی کی ہے ۔ اور نیک عملی کے لئے فتح مندی و کامرانی کا اثبات کیا ہے ۔ ان تمام مقامات میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ مثلاً إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۶ : ۲۱) إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ (۱۰ : ۱۷) إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۲۳ : ۱۱۸) لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (۱۰ : ۸۱) إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۹ : ۳۸) إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۱ : ۸۶) وغیرہ ۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا ۔ یعنی اس کا قانون ہے کہ ظلم کے لئے کامیابی و فلاح نہیں ہوتی ۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا ۔ یعنی اس کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ ان پر بند کر دیتا ہے ۔ اور وہ گمراہی و کوری کی زندگی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے ان مقامات کا ترجمہ غور و فکر کے ساتھ نہیں کیا ۔ اس لئے مطالب اپنی اصل شکل میں واضح نہ ہو سکے ۔

"تمتع"

اور پھر اصطلاح قرآنی میں یہی وہ "تمتع" ہے ۔ یعنی زندگی سے فائدہ اٹھانے کی مہلت جس کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے اور جو یکساں طور پر سب کو دی گئی ہے ۔

بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ (۲۱ : ۴۵)

بلکہ یہ بات ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کے موقعے دیئے یہاں تک کہ (خوش حالی کی) ان پر بڑی بڑی عمریں گذر گئیں ۔

اسی طرح وہ جا بجا مَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (۱۰ : ۹۸) ، مَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ (۳۶ : ۴۴) ، فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۱۶ : ۵۵) وغیرہ تعبیرات سے بھی اسی حقیقت پر زور دیتا ہے ۔

"قضاء بالحق" اور اقوام و جماعات

اسی طرح وہ قانونِ قضاء بالحق کو جماعتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بھی منطبق کرتا ہے ۔ اور کہتا ہے

جس طرح کا قانونِ انتخاب ، افراد و اجسام میں جاری ہے ۔ اسی طرح اقوام و جماعات میں بھی جاری ہے ۔ جس طرح فطرت ، نافع اشیاء کو باقی رکھتی ، غیر نافع کو چھانٹ دیتی ہے ۔ ٹھیک اسی طرح جماعتوں میں میں بھی صرف اسی جماعت کے لئے بقا ہوتی ہے ۔ جس میں دنیا کے لئے نفع ہو ۔ جو جماعت غیر نافع ہو جاتی ہے ۔ چھانٹ دی جاتی ہے وہ کہتا ہے یہ اس کی "رحمت" ہے ۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں انسانی ظلم و طغیان کے لئے کوئی روک تھام نظر نہ آتی :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

(اور (دیکھو) اگر اللہ (نے جماعتوں اور قوموں میں باہم

بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ۝
(۲ : ۲۵۲)

گر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ) بعض آدمیوں کے ذریعے بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی لیکن اللہ کائنات کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پہ یہی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ
فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۲۲ : ۴۰)

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعے بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا تو دیقین کرو دنیا میں انسان کے ظلم و فساد کے لئے کوئی روک باقی نہ رہتی اور) یہ تمام خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں، جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ منہدم ہوکر رہ جاتیں۔

"قضاء بالحق" کے اجتماعی نفاذ میں بھی تدریج و امہال اور تاجیل ہے

لیکن وہ کہتا ہے جس طرح فطرت کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے معاملہ میں بھی وہ جو کچھ کرتی ہے۔ بتدریج کرتی ہے اور اصلاح حال اور رجوع و انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رکھتی ہے۔ کیونکہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا
مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ
ذٰلِكَ ۚ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ
وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝
(۷ : ۱۶۸)

اور ہم نے ایسا کیا کہ ان کے لئے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے۔ ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے بعض دوسری طرح کے، پھر ہم نے انہیں اچھائیوں، اور برائیوں، دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا تاکہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لئے فطرت نے اسباب و علل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی ہے اسی طرح اقوام کے زوال و ہلاکت کے لئے بھی موجباتِ ہلاکت کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے اور یہ ان کی "اجل" ہے۔ جب تک یہ اجل نہیں آچکتی، قانونِ الٰہی یکے بعد دیگرے تنبہ و اعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ
فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ
ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ۝
(۹ : ۱۲۶)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پہ کوئی برس ایسا نہیں گذرتا کہ ہم انہیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائش میں نہ ڈالتے ہوں دیعنی ان کے اعمال بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

لیکن اگر تنبہ و اعتبار کی یہ تمام مہلتیں رائیگاں گئیں اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ وقت آجائے تو پھر یہ فطرت کا آخری، اٹل اور بے پناہ فیصلہ ہے۔ نہ تو اس میں ایک لمحہ کے لئے تاخیر ہو سکتی ہے۔ یہ نہ اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ پہلے آسکتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ج فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ٥

(۷ : ۳۴)

اور (دیکھو) ہر امت کے لئے ایک مقررہ وقت ہے سو جب ان کا مقررہ وقت آچکتا ہے تو اس سے نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے رہ سکتے ہیں۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتٰبٌ مَّعْلُوْمٌ ٥ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵ : ۴-۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق، ایک مقررہ میعاد اس کے لئے موجود تھی۔ کوئی امت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اسی طرح "بقاء الفع" اور "قضا بالحق" کا قانون پچھلی قوم کو چھانٹ دیتا ہے اور اسی جگہ ایک دوسری قوم لا کھڑی کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ٥ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ٥ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ط اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ م بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ٥

(۶ : ۱۳۱—۱۳۳)

یہ (تبلیغ و ہدایت کا تمام سلسلہ) اس لئے ہے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم و ستم سے ہلاک کر ڈالے اور ان کے بسنے والے حقیقتِ حال سے بے خبر ہوں (اس کا قانون تو یہ ہے) کہ جو کچھ جس کا عمل ہے اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے۔ اور اسی وجہ کے مطابق اچھے بُرے نتائج ظاہر ہوتے ہیں) اور یاد رکھو جیسے کچھ لوگوں کے اعمال ہیں، تمہارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے۔ تمہارا پروردگار رحمت والا بے نیاز ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہارا جانشین بنا دے۔ اسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اوروں کا جانشین بنا دے۔

انفرادی زندگی اور مجازاتِ دنیوی

اسی طرح وہ کہتا ہے۔ یہ بات کہ انفرادی زندگی کے اعمال کی جزاء دنیوی زندگی سے تعلق نہیں رکھتی آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے، اور دنیا میں نیک و بد، سب کے لئے یکساں طور پر مہلتِ حیات اور فیضانِ معیشت ہے۔ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں "رحمت" کی کار فرمائی ہے۔ رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہوا اور مہلتِ حیات سب کو پوری طرح ملے۔ اس نے انسان کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ دنیوی زندگی کا ہے۔ اور سرتاسر مہلت ہے دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے۔ اور اجزاء کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ٥

(۱۸ : ۵۸)

اور (اے پیغمبر! یقین کرو) تمہارا پروردگار بڑا بخشنے والا صاحبِ رحمت ہے۔ اگر وہ ان لوگوں سے ان کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا لیکن ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے اور جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لئے کوئی پناہ کی جگہ انہیں نہیں ملے گی۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا ط وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ۔ (۶ : ۲)

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر تمہاری زندگی کے لئے ایک وقت ٹھہرا دیا اور اسی طرح اس کے پاس ایک اور بھی ٹھہرائی ہوئی میعاد ہے (یعنی قیامت کا دن)

معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ و انابت

وہ کہتا ہے، جس طرح عالم اجسام میں تم دیکھتے ہو کہ فطرت نے ہر کمزوری و فساد کے لئے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اصلاح حال کا دروازہ بند نہیں کرتی۔ اور مہلتوں پر مہلتیں دیتی رہتی ہے نیز اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے، تو اسے قبول کر لیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہاں بھی توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو لیکن جونہی توبہ و انابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے۔ رحمت الٰہی قبولیت کا دروازہ معاً کھول دیتی ہے۔ اور اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے۔ گویا اس کے دامنِ عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا! التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ :۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۵ (۱۵ : ۷۰)

ہاں، مگر جس کسی نے توبہ کی، ایمان لایا اور آئندہ کے لئے نیک عملی اختیار کی، تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے!

رحمت الٰہی اور مغفرت و بخشش کی وسعت و فراوانی!

اس بارے میں قرآن نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی کوئی حدود انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں۔ کتنے ہی سخت گناہ ہوں۔ کتنی ہی مدت کے گناہوں لیکن ہر اس انسان کے لئے جو اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے، رحمت و قبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہو سکتی!

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ط (۳۹ : ۵۴)

اے میرے بندو! جنہوں نے (بدعملیاں کر کے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ (تمہاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مگر) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے۔

اسلامی عقائد کا دینی تصور اور "رحمت"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے انسان کے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے۔ اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے۔ کیوں کہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائنات فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا بلکہ اسی کا

ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے۔ اور اس لئے کہتا ہے۔ جس کارسازِ فطرت نے تمام کارخانۂ ہستی کی بنیاد "رحمت" پر رکھی ہے۔ ضروری تھا کہ اس گوشہ میں بھی اس کے تمام احکام سرتاسر "رحمت" کی تصویر ہوں!

خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے

چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ اور یہی عبودیت اسی کی عبودیت ہے۔ جس کے لئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲: ۱۶۵)

اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں، جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۳: ۳۱)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے، کہہ دو، اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو، تو چاہیئے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبت الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں، اگر تم نے ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے۔ بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دیگا۔ اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے!

وہ جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے۔ کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت اور محبوبیت ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (۵: ۵۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا۔ تو وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوتِ حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا، عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کر دے گا۔ جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے اس کے بندوں سے محبت کرے

لیکن بندے کے لئے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے، وہ کہتا ہے، خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گذری ہے، جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے اسے چاہیئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے :-

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲: ۱۷۷)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں، ہمارا یہ کھلانا، اس کے سوا

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (٧٦: ٨-٩)

کچھ نہیں ہے۔ کہ محض اللہ کے لئے ہے۔ ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں۔ نہ کسی طرح کی شکر گزاری!

ایک حدیث قدسی میں یہی حقیقت نہایت موثر پیرائے میں واضح کی گئی ہے۔

یا ابن آدم، مرضت فلم تعدنی۔ قال کیف اعودک وانت رب العلمین؟ قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعدہ؟ اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ؟ یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی، قال یا رب کیف اطعمک وانت رب العلمین؟ قال اما علمت انہ استطعمک عبدی فلان فلم تطعمہ اما علمت انک لو اطعمتہ لوجدت ذلک عندی؟ یا ابن آدم استسقیتک فلم تسقنی قال کیف اسقیتک وانت رب العلمین؟ قال استسقاک عبدی فلان فلم تسقہ اما انک لو سقیتہ لوجدت ذلک عندی؟ (مسلم عن ابی هریرة)

(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا) اے ابنِ آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور تو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا۔ مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا۔ مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ تجھے پیاس لگے۔ تو تو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا۔ میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

اعمال و عبادات اور اخلاق و خصائل

اسی طرح قرآن نے اعمال و عبادات کی جو شکل و نوعیت قرار دی ہے۔ اخلاق و خصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے۔ اوامر و نواہی میں جو جو اصول و مبادی ملحوظ رکھے ہیں۔ ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے۔ اور یہ چیز اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ بحث و بیان کی ضرورت نہیں ؛

قرآن سر تا سر رحمتِ الٰہی کا پیام ہے

اور پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دہرایا ہے اور نہ کوئی مطلب اس درجہ اس کے صفحات میں نمایاں ہے۔ جس قدر رحمت ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کئے جائیں۔ جہاں "رحمت" کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو تین ۳ سو سے

زیادہ مقامات ہوں گے۔ اور اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لئے۔ جہاں اگرچہ لفظ "رحمت" استعمال نہیں ہوا ہے لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے۔ مثلاً ربوبیت، مغفرت، رأفت، کرم، حلم عفو وغیرہا، تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن اول سے لیکر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا پیام ہے۔

بعض احادیثِ باب

ہم اس موقع پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں۔ جن کا ذخیرہ احادیث میں موجود ہے کیوں کہ یہ مقام زیادہ تفصیل و بحث کا متحمل نہیں۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتلائی ہے وہ تمام تر یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت۔ ایک مشہور حدیث جو ہر مسلمان واعظ کی زبان پر ہے، ہمیں بتلاتی ہے کہ انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء[1]۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لئے ہے جو اس کے بندوں کے لئے رحمت رکھتے ہیں حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشہور کلمۂ وعظ زمین پر رحم کرو، تاکہ وہ، جو آسمان پر ہے، تم پر رحم کرے بجنسہٖ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر بھی طاری ہوا ہے۔ الرحمٰن تبارک وتعالیٰ۔ ارحموا من فی الارض، یرحمکم من فی السماء[2]۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام نے انسانی رحمت و شفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنی چاہی ہے وہ اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ رحم ایک چڑیا ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ من رحم ولو ذبیحۃ عصفور، رحمہ اللہ یوم القیٰمۃ[3]۔

مقام انسانیت اور صفاتِ الٰہی سے تخلق و تشبہ

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفتوں کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ انسان کا جوہر انسانیت جو اسے حیوانات کی سطح سے بلند و ممتاز کرتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صفات الٰہی کا پرتو ہے اور اس لئے انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ اس میں زیادہ ہے۔ زیادہ صفات الٰہی سے تخلق و تشبہ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جہاں کہیں بھی انسان کی خاص صفات کا ذکر ہے انہیں براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔ حتیٰ کہ جوہر انسانیت کو خدا کی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا ہے۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۳۲ : ۸) یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا:

[1] طبرانی و ابن جریر بسند صحیح ۱۲

[2] امام احمد نے مسند میں، ترمذی اور ابو داؤد نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ ورویناہ مسلسلاً من طریق الشیخ محمود شکری الالوسی العراقی، وایضاً عن والدی المرحوم عن الشیخ صدر الدین الدھلوی من طریق الشیخ احمد ولی اللہ رحمہ اللہ ۱۲

[3] رواہ البخاری فی الادب المفرد والطبرانی عن ابی امامۃ وصححہ السیوطی فی الجامع الصغیر۔

در ازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد

پس اگر وہ خدا کی رحمت کا تصور ہم میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی سرتا پا رحمت و محبت ہو جائیں۔ اگر وہ اس کی ربوبیت کا مرقع بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی اپنے چہرۂ اخلاق میں ربوبیت کے سارے خال و خط پیدا کر لیں۔ اگر وہ اس کی رافت و شفقت کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے لطف و کرم کا جلوہ دکھاتا ہے۔ اس کے جود و احسان کا نقشہ کھینچتا ہے تو اسی لئے کہ وہ چاہتا ہے۔ ہم میں بھی ان الٰہی صفتوں کا جلوہ نمودار ہو جائے۔ وہ بار بار ہمیں سناتا ہے۔ کہ خدا کی بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیئے اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے۔ تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لئے اس کی بخشائشوں کا انتظار کریں۔

احکام و شرائع

جہاں تک احکام و شرائع کا تعلق ہے بلاشبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیوں کہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی۔ مجاز ہوتا لیکن اس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو اور جو دشمن کو بخش دینا سیکھ لے گا۔ اس کا دل خود بخود انسانی بغض و نفرت کی آلودگیوں سے پاک ہو جائے گا۔

اَلْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۚ (۳ : ۱۳۴)

غصہ ضبط کرنے والے اور انسانوں کے قصور بخش دینے والے اور اللہ کی محبت انہی کے لئے ہے جو احسان کرنے والے ہیں!

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳ : ۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی و ناگواری) برداشت کر لی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی، پوشیدہ و علانیہ (اس کے بندوں کے لئے) خرچ کی اور برائی کا جواب برائی سے نہیں نیکی سے دیا، تو (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔

وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ٥ (۴۲ : ۴۳)

اور (دیکھو) جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ٥ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ج

اور (دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی (اگر کوئی برائی کرے تو) برائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو اچھا طریقہ ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ جس شخص سے تمہاری عداوت تھی، یکایک تمہارا دلی دوست ہو گیا ہے۔ البتہ یہ ایسا مقام ہے جو اسی کو مل سکتا ہے جو بدسلوکی سہہ لینے کی برداشت رکھتا

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ٥ (۴۱: ۳۴-۳۵)

ہو اور جسے (نیکی وسعادت کا) حصۂ وافر ملا ہو۔

بلاشبہ اس نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا اور وہ کیوں کر روک سکتا تھا جبکہ طبیعت حیوانی کا یہ فطری خاصہ ہے اور حفاظتِ نفس اس پر موقوف ہے۔ لیکن یہاں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے۔ ساتھ ہی عفو وبخشش اور بدی کے بدلے نیکی کرنے کی مؤثر ترغیب بھی دے دی ہے اور ایسی مؤثر ترغیب دی ہے کہ ممکن نہیں ایک خدا پرست انسان اس سے متاثر نہ ہو:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ٥ (۱۶: ۱۲۶)

اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہیئے جتنی اور جیسی کچھ بُرائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو) لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لو تو (یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کے لئے برداشت کر جانے ہی میں بہتری ہے۔

وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ (۴۲: ۴۰)

اور بُرائی کے لئے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلہ ہے جیسی اور جتنی بُرائی کی گئی ہے۔ لیکن جس کسی نے درگذر کیا اور معاملہ کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

انجیل اور قرآن

ہم نے قرآن کی آیاتِ عفو وبخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیوں کہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی۔ لحاظ ہوتا ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ، رحم ومحبت اور عفو وبخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا۔ اور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے۔ چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں "تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا" یا "اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو" یا "مثلاً اگر تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیئے دوسرا گال بھی آگے کر دو" سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل وایثار کا ایک مؤثر پیرایۂ بیان تھا یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوتِ مسیحؑ اور دنیا کی حقیقت فراموشی

افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔ دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی اور اس لئے دونوں کو تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابلِ عمل احکام ہیں معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہے۔ کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے۔ اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو۔ لیکن عملی نقطۂ خیال سے اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔

فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے۔ جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلّم کے ساتھ جائز رکھی گئی جس طرح بے درد نکتہ چینیوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم وبصیرت سے انکار کر دیا۔

حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو فطرت انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے

لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو۔ ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف تھی اور اس لئے ناقابلِ عمل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اسے تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی سچائی سے انکار کر دیں۔ کیوں کہ جو تعلیم فطرت انسانی کے خلاف ہے وہ کبھی انسان کے لئے سچی تعلیم نہیں ہو سکتی لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوگا بلکہ اس کی دعوت کی اصلی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ اس کی دعوت بنیادی اصل یہ ہے۔ کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے، پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی تفریق بین الرسل ہے۔ یعنی ایمان وتصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا۔ کسی ایک کو ماننا، دوسروں کو جھٹلانا، یا سب کو ماننا۔ کسی ایک کا انکار کر دینا۔ اسی لئے اس نے جا بجا اسلام کی راہ یہ بتلاتی ہے کہ:۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳: ۸۴)

ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی نہ مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اس کی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو، ہمارا اس پر ایمان ہے!)

علاوہ بریں خود قرآن نے حضرت مسیحؑ کی دعوت کا یہی پہلو جا بجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت ومحبت کے پیامبر تھے اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت وقساوت کے مقابلہ میں مسیحی اخلاق کی رقّت ورافت کی باربار مدح کی ہے:۔

وَلِنَجْعَلَهٗ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ۝ (۱۹: ۲۱)

اور تاکہ ہم اس کو (یعنی مسیحؑ کے ظہور کو) لوگوں کے لئے ایک الٰہی نشانی اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں اور یہ بات (مشیّت الٰہی میں) طے شدہ تھی۔

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ط (۵۷: ۲۷)

اور ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے (مسیحؑ کی) پیروی کی۔ ہم نے شفقت اور رحمت ڈال دی۔

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کئے ہیں۔ پوری فراخ دلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات وانجیل کے لئے بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا رہنما قرار دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں:

وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ، وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ

التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۵: ۴۶) یہ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرتِ بشری کے خلاف اور ناقابلِ عمل ہو، وہ کبھی نور و ہدایت اور مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ نہیں ہو سکتی۔

دعوتِ مسیحی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت ہی نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا۔ جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش۔ دینداری و خداپرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر ناآشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے۔ کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیئے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا۔ طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا۔ زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا۔ آباد شہروں کو بلا وجہ جلا کر خاکستر کر دینا اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

ضرورت تھی کہ بنی نوع انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے، صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر، اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کی توجہ دلائی۔ اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا!

مواعظِ مسیحؑ کے مجازات کو تشریع و حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہے

معمولی سے معمولی کلام بھی بشرطیکہ بلیغ ہو اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے۔ جو اس کی تاثیر کا زیور اور اسکی دلنشینی کی خوبروئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دوراز کار عقائد پیدا کرنے والی تھی۔ ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی۔ اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔

انہوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں" کو پیار کرو" تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیئے اپنے دشمنوں کا عاشقِ زار ہو جائے۔ بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پرجوش جذبہ ہونا چاہیئے اور ایسا ہونا چاہیئے کہ دوست تو دوست دشمن تک کے ساتھ عفو و درگذر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لئے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور موثر پیرایۂ بیان ہے، کہ دشمنوں تک کو پیار کرو، ایک ایسے گرد و پیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو۔ رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلےٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کر دیتا تھا:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا ۔۔۔ دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلافست وجنگ

یا مثلاً اگر انہوں نے کہا، "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو"، تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ کو تم اپنا گال آگے کر دو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگذر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغتِ کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اسی طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے، تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی، بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے۔ یک قلم مختل ہو جائے گا!

اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے نہ کہ تعزیر و انتقام

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیحؑ نے سزا کی جگہ محض رحم و درگذر ہی پر زور دیا تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا لیکن اس لئے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہٖ کوئی مستحسن عمل ہے بلکہ اس لئے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لئے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی برائی تھی جو اس لئے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کا حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں، میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں؟ تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی۔ جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری دہشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا۔[1] پس اگر حضرتِ مسیحؑ نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سرتاسر رحم و درگذر پر زور دیا تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ نفسِ تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنی چاہتے تھے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتلانا چاہتے تھے۔ کہ اعمالِ انسانی میں اصل، رحم و محبت ہے۔ تعزیر و انتقام نہیں ہے۔ اور اگر تعزیر و سیاست جائز رکھی گئی ہے۔ تو صرف اس لئے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں آ جائے اس لئے نہیں کہ تمہارے دل و رحم و محبت کی جگہ سرتاسر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں۔

شریعت موسوی کے پیروؤں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے بتلایا۔ کہ شریعت سزا دینے کے لئے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے۔ اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت و محبت کی راہ ہے!

[1] شاید انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ جس انجیل کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ کسی حالت میں بدلہ لینے اور سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی اسی انجیل کے پیروؤں نے نوعِ انسانی کی تعذیب و ہلاکت کا عمل ایسی دہشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج ہم اس کا تصور بھی بغیر دہشت و ہراس کے نہیں کر سکتے اور پھر یہ جو کچھ کیا گیا، انجیل اور اس کے مقدس معلم کے نام پر کیا گیا!

"عمل" اور "عامل" میں امتیاز

در اصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ "عمل" میں اور "عامل" میں امتیاز نہیں رکھتا، حالانکہ جہاں تک مذہب کی تعلیم کا تعلق ہے اس بات میں کہ ایک عمل کیسا ہے اور اس میں کہ کرنے والا کیسا ہے، بہت بڑا فرق ہے اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ بلاشبہ تمام مذاہب کا یہ عالمگیر مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کر دیں۔ لیکن یہ انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے۔ یقیناً انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے اور بسا اوقات ان کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے یا لوگوں سے کہے، ڈرو اور نفرت کرو؛ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیمار ہی کا وجود ہوتا ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مستحق ہو جائے گا۔

مرض اور مریض

پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لئے نفرت لیکن بیمار کے لئے شفقت و ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح روح و دل کے طبیب بھی گناہوں کے لئے نفرت لیکن گنہگاروں کے لئے سرتاپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں،) ہم میں دہشت و نفرت پیدا کر دیں۔ لیکن گناہوں سے پیدا کر دیں، گنہگار انسانوں سے نہیں اور یہی وہ نازک مقام ہے۔ جہاں ہمیشہ پیروانِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی ہے، مذاہب نے چاہا تھا انہیں بُرائی سے نفرت کرنا سکھلائیں۔ لیکن بُرائی سے نفرت کرنے کی جگہ انہوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنہیں وہ اپنے خیال میں بُرائی کا مجرم تصور کرتے ہیں!

گناہوں سے نفرت کرو مگر گناہگاروں پر رحم کرو

حضرت مسیحؑ کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت کی دعوت تھی۔ گناہوں سے نفرت کرو مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روح و دل کی تندرستی باقی نہ رہی۔ لیکن اگر اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے۔ تو تم اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر اور زیادہ تمہارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہے۔ تم اپنے بیمار بھائی کی تیمار داری کرو گے یا اسے جلّاد کے تازیانے کے حوالے کر دو گے؟ وہ موقع یاد کرو جس کی تفصیل ہمیں سینٹ لوقا کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔ جب ایک گناہگار عورت حضرت مسیحؑ کی خدمت میں آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے ان کے پاؤں پونچھے تو اس پر ریاکار فریسیوں کو (اور اب فریسیت کے معنی ہی ریاکاری کے ہو گئے ہیں۔ PHARISAISM) سخت تعجب ہوا، لیکن انہوں نے کہا، طبیب بیماروں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تندرستوں کے لئے۔ پھر خدا اور اس کے گناہگار بندوں کا رشتہ رحمت واضح کرنے کے لئے ایک نہایت ہی مؤثر اور دل نشین مثال بیان کی فرض کرو، ایک ساہوکار کے دو قرضدار تھے، ایک پچاس روپیہ کا، ایک ہزار روپیہ کا، ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کر دیا، بتلاؤ کس قرض دار پر اس کا احسان زیادہ ہوا۔ اور کون اس سے زیادہ محبت کرے گا۔ وہ جسے پچاس معاف کر دیئے، یا وہ جسے ہزار؟

نصیبِ ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحقِ کرامت گناہگار انند

یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض ائمہ تابعین نے اشارہ کیا ہے :- انکسار العاصیین احب الی اللہ من صولۃ المطیعین :- خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے۔

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

قرآن اور گناہگار بندوں کے لئے صدائے تشریف و رحمت

اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں۔ جہاں کہیں خدا نے گناہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے، یا ان کا ذکر کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔ قُل یٰعبادیَ الّذینَ اسرفوا علی انفسھم۔ (۳۹ : ۵۴) ءَ انتم اضللتم عبادی (۲۵ : ۱۸) اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہے۔ تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتۂ پدری پر زور دیتا ہے "اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند! حضرت امام جعفر صادق نے سورۂ زمر کی آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ سمجھ جاتے ہیں۔ ہم ان پر غضبناک نہیں۔ قرآن میں خدا نے بیس[2] سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عِبَادِیْ کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گناہگار انسانوں کو بھی یٰعِبَادِیْ کہہ کر پکارا ہے کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے؟

صحیح مسلم کی مشہور حدیث کا مطلب کس طرح واضح ہو جاتا ہے، جب ہم اس روشنی میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

وَالّذی نفسی بیدہٖ لو لم تذنبوا، لذھب اللہ بکم و جآء بقوم یذنبون فیستغفرون (مسلم عن ابی ھریرۃ رضؓ)[1]	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے۔

خدا کے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار
بعذر خواہیٔ رندانِ بادہ نوش آمد!

---

[1] وایضاً عن انس قال قال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہٖ لو اخطأتم حتی تملأ خطایاکم ما بین السمآء والارض ثم استغفرتم اللہ یغفر لکم والذی نفسی بیدہٖ لو لم تخطئون لجاء اللہ بقوم یخطئون ثم یستغفرون فیغفر لھم۔ اخرجہ احمد و ابو یعلی باسناد رجالہ ثقات، وعن ابن عمر مرفوعاً۔ لو لم تذنبوا لخلق اللہ خلقا یذنبون ثم یغفر لھم۔ اخرجہ احمد والبزار ورجالھم ثقات۔ واخرج البزار من حدیث ابی سعید نحو حدیث ابی ھریرۃ۔ فی الصحیح، وفی اسنادہ یحیی بن بکیر وھو ضعیف۔

اصلاً انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں

پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے، فرق صرف محلِ بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا کیوں کہ شریعت موسوی موجود تھی اور وہ اس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن قرآن کو اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان کرنے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس نے پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جو مجازات و متشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تلا پیرایۂ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے عفو و درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا کہ ناگزیر حالتوں میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کہہ دیا کہ بدلے اور سزائیں کس طرح کی ناانصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ یقیناً دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝	اور (دیکھو) برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوار لے (تو یقین کرو) اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔
وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۭ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب الیم ہے!
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝	اور جو کوئی بدلہ لینے کی جگہ برائی برداشت کر جائے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے!

(۴۲ : ۴۳)

اسلوب بیان پر غور کرو اگرچہ ابتدا میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ”فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ“ بظاہر عفو و درگزر کے لئے اتنا کہہ دینا کافی تھا لیکن آخر میں پھر دوبارہ اس پر زور دیا:۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ، اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ یہ تکرار اس لئے ہے کہ عفو و درگزر کی اہمیت واضح ہو جائے یعنی یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہو جائے کہ اگرچہ بدلے اور سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔ لیکن نیکی و فضیلت کی راہ عفو و درگزر ہی کی راہ ہے!

پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے۔ برائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا۔ ”جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا“ یعنی ”سیئۃ“ کے بدلے میں جو کچھ کیا جائیگا۔ وہ بھی ”سیئۃ“ ہی ہو گا۔ عملِ حسن نہیں ہو گا۔ لیکن اس کا دروازہ اس لئے باز رکھا گیا کہ اگر باز نہ رکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں آنے لگیں گی پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے ”اصلح“ کا لفظ کہا۔ یعنی سنوارنے والا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں بگاڑنے اصلی سنوارنے والے وہی ہوئے جو بدلے کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

قرآن کے زواجر و قوارع

ممکن ہے بعض طبیعتیں یہاں ایک خدشہ محسوس کریں اگر فی الحقیقت قرآن کی تمام تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت زجر و توبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟

اس کا مفصل جواب تو اپنے محل میں آئے گا لیکن تکمیلِ بحث کے لئے ضروری ہے کہ یہاں مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے مخالفوں کے لئے شدت و غلظت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لئے؟ ان کے لئے جن کی مخالفت محض اختلافِ فکر و اعتقاد کی مخالفت تھی؟ یعنی ایسی مخالفت جو معاندانہ اور جارحانہ نوعیت نہیں رکھتی تھی؟ نہیں اس سے قطعاً انکار ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام قرآن میں شدت و غلظت کا ایک لفظ بھی نہیں مل سکتا جو اس طرح کے مخالفوں کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔ اس نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے۔ اس کا تمام تر تعلق ان مخالفوں سے ہے جن کی مخالفت بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت تھی اور ظاہر ہے کہ اصلاح و ہدایت کی کوئی تعلیم بھی اس صورتِ حال سے گریز نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی و شفقت ملحوظ رکھی جائے تو بلاشبہ یہ رحمت کا سلوک تو ہوگا، اگر انسانیت کے لئے نہیں ہوگا ظلم و شرارت کے لئے ہوگا، اور یقیناً سچی رحمت کا معیار یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ظلم و فساد کی پرورش کرے۔ ابھی چند صفحوں کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی اس کی جگہ دی ہے اور سورۂ فاتحہ میں ربوبیت اور رحمت کے بعد عدالت ہی کی صفت جلوہ گر ہوئی ہے یہ اسی لئے ہے کہ وہ رحمت سے عدالت کو الگ نہیں کرتا، بلکہ اسے عین رحمت کا مقتضا قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر ظلم و شرارت کے لئے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو، سانپ کے بچے، اور ڈاکوؤں کا مجمع کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ

قرآن نے "کفر" کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انکار محض ہو، ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔

انکارِ محض سے مقصود یہ ہے ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس لئے کہ اس میں طلبِ صادق نہیں ہے، یا اس لئے کہ جو راہ چل رہا ہے۔ اسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی وجہ ہو لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے۔ جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے اندر تمہارے خلاف بغض و عناد کا ایک

غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائے گا۔ تم کتنی ہی اچھی بات کہو، وہ تمہیں جھٹلائے گا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو۔ وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم کہو، روشنی تاریکی سے بہتر ہے، تو وہ کہے تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ تم کہو، کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے تو وہ کہے نہیں کڑواہٹ ہی میں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے۔

یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی نوعیت کے مخالف ہیں جن کے لئے اس کے تمام زواجر و قوارع ظہور میں آئے ہیں:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷ : ۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں۔ مگر سوچتے نہیں ان کے پاس آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں۔ مگر سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہو گئے ہیں، جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے!

ہمارے مفسر اسی دوسری حالت کو
«کفر جحود» سے تعبیر کرتے ہیں!

دنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے۔ تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے۔ کچھ نے انکار کیا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنہوں نے اس کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھا بندی کر لی ہے۔ قرآن کا جب ظہور ہوا، تو اس نے بھی یہ تینوں جماعتیں اپنے سامنے پائیں۔ اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا۔ دوسری کو دعوت و تذکیر کا مخاطب بنایا۔ مگر تیسری کے ظلم و طغیان پر حسبِ حالت و ضرورت زجر و توبیخ کی۔ اگر ایسے گروہ کے لئے بھی اس کے لب و لہجہ کی سختی «رحمت» کے خلاف ہے تو بلاشبہ اس معنی میں قرآن رحمت کا معترف نہیں اور یقیناً اس ترازو سے اس کی رحمت نہیں تولی جا سکتی۔

تم بار بار سن چکے ہو کہ وہ دین حق کے معنوی قوانین کو کائنات فطرت کے عام قوانین سے الگ نہیں قرار دیتا۔ بلکہ انہی کا ایک گوشہ قرار دیتا ہے۔ فطرت کائنات کا اپنے فعل و ظہور کے ہر گوشے میں کیا حال ہے؟ یہ حال ہے کہ وہ اگرچہ سر تا سر رحمت ہے لیکن رحمت کے ساتھ عدالت اور بخشش کے ساتھ جزا کا قانون بھی رکھتی ہے۔ پس قرآن کہتا ہے۔ میں فطرت سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری جس موہوم رحمت سے فطرت کا خزانہ خالی ہے۔ یقیناً میرے آستین و دامن میں نہیں مل سکتی۔

فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ

اللہ کی فطرت، جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی اللہ کی ٹھہرائی

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ج	ہوئی فطرت، سچا اور ٹھیک دین ہے
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ہ	لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت سے
(۳۰ : ۲۹)	بے خبر ہیں۔

قرآن کے ان تمام مقامات پر نظر ڈالو جہاں اس نے سختی کے ساتھ منکروں کا ذکر کیا ہے، یہ حقیقت بہ یک نظر واضح ہو جائے گی۔

(۵)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ربوبیت اور رحمت کے بعد جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ عدالت ہے اور اس کے لئے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ط کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

اَلدِّین

سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ "دان" اور "دین" ہے جو بدلہ اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا۔ اور پھر آئین و قانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں "دینیہ" نے شریعت و قانون کا مفہوم پیدا کر لیا، خورد اوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین و قواعد کو بھی "دین دبیرہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام "دین کارت" ہے۔ جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی ۔

بہرحال عربی میں "الدِّین" کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔ خواہ اچھائی کا ہو خواہ برائی کا۔

متعلم ليلىٰ انما دين تدانيت
داع عزيم في التقاضي غريمها

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی ہوئے وہ، جو جزا کے دن کا حکمران ہے۔ یعنی روزِ قیامت کا، اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں:-

"دین" کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کر دی

اولاً قرآن نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزا کے لئے "الدِّین" کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی لئے وہ قیامت کو بھی عموماً "یَوْمِ الدِّیْنِ" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جزا کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی تعبیر تھی۔ وہ جزا کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت پیروانِ مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خدا کی خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ، تمام مذہبی تصورات کی طرح، اس معاملے میں بھی گمراہیٔ فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لئے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غیظ و غضب میں آنے لگ جاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوشِ غضب ٹھنڈا کرنے کے لئے قربانیاں کرتے، اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لئے نذریں چڑھاتے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصور دیومانی تصورات سے بلند ہو گیا تھا لیکن جہاں تک اس

معاملے کا تعلق ہے ان کے تصوّر نے بھی کوئی وسیع ترقی نہیں کی تھی۔ یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ خاندان اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے لیکن پرانے دیوتاؤں کی طرح یہ خدا کی شاہی اور مطلق العنانی کا خدا تھا۔ وہ کبھی خوش ہو کر انہیں اپنی چہیتی قوم بنا لیتا۔ کبھی جوشِ انتقام میں آکر بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوبیت ہو گئی اور جب تک خدا نے اپنی صفتِ ابنیت کو بشکلِ مسیحؑ قربان نہیں کر دیا۔ اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

مجازاتِ عمل کا معاملہ بھی دنیا کے عالمگیر قانونِ فطرت کا ایک گوشہ ہے

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا جو کائناتِ ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے۔ اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے، ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں۔ اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں۔ اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں۔ اسی طرح روحِ انسانی کے لئے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ معنوی مؤثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں جزا و سزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ بُرے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے، ثواب اور عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحیِ الٰہی نے ہماری فہم و استعداد کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے۔ ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم ان کے لئے ہیں۔ جن کے اعمال بہشتی ہوں گے، دوزخ کی عقوبتیں ان کے لئے ہیں جن کے اعمال دوزخی ہوں گے۔

لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ٥ (٥٩: ٢٠)	اصحابِ جنّت اور اصحابِ دوزخ (اپنے اعمال و نتائج میں) یکساں نہیں ہو سکتے۔ کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحابِ جنت ہیں!

جس طرح مادّیات میں خواص و نتائج ہیں، اسی طرح معنویات میں بھی ہیں

وہ کہتا ہے تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانونِ مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیّر و تساہل ہو فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے اب سوزش و تپش فطرت کی وہ مکافات ہو گئی۔ جو ہر اس انسان کے لئے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کود و اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اُترو اور اس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرتِ کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لئے مکافات نہ رکھے۔ یہی مکافات جزا و سزا ہے۔

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی

ہے۔ کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا کیوں کہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں۔ تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے۔ افسوس تم پر، تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو!

تم گیہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہو گا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے کیوں؟ اس لئے کہ فطرت کے قانونِ مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمہارے وہم دگمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لیکر بڑے قسم کا گیہوں دے گی۔ تم جانتے ہو کہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتلاؤ جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہو کیوں کر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ
اَنۡ نَّجۡعَلَہُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاہُمۡ
وَ مَمَاتُہُمۡ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ۝
وَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ
بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا
کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ۝
(۴۵ : ۲۱ - ۲۲)

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو) افسوس ان کے فیصلے پر۔ اللہ نے آسمان و زمین کو بیکار و عبث نہیں بنایا ہے، بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اسلئے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جزا و سزا کے لئے اَلدِّیۡن کا لفظ اختیار کیا کیوں کہ مکافاتِ عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا:

اصطلاحِ قرآنی میں "کسب"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں۔ اس نے اچھے برے کام کرنے کو جا بجا "کَسَبَ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، "کَسَبَ" کے معنی عربی میں ٹھیک ٹھیک وہی ہیں۔ جو اُردو میں کمائی کے ہیں یعنی ایسا کام جس کے نتیجے سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو اگرچہ فائدہ کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لئے جزا اور سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے۔ جیسی کسی کی کمائی ہو گی۔ ویسا ہی نتیجہ پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کر لی ہے۔ تو اس کے لئے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کر کے برائی کمائی ہے تو اس کے لئے برائی ہے:-

کُلُّ امۡرِیًٔۢ بِمَا کَسَبَ رَہِیۡنٌ ۝
(۵۲ : ۲۱)

ہر انسان اس نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے!

سورۂ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ بتلایا:-

لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا
مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ
(۲ : ۲۸۶)

ہر انسان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہو گی جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے اور جس کے لئے جواب دہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے!

اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتلا دیا:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۝ (۲ : ۱۳۴)

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی اس کے لئے
وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے
وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔

من عمل صالحاً فلنفسه ومن اساء فعليها

علاوہ بریں صاف صاف لفظوں میں جا بجا یہ حقیقت واضح کر دی کہ اگر دین الٰہی نیک عملی کی ترغیب دیتا ہے اور بد عملی سے روکتا ہے۔ تو یہ صرف اس لئے ہے کہ انسان نقصان و ہلاکت سے بچے اور نجات و سعادت حاصل کرے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و قہر اسے عذاب دینا چاہتا ہو اور اس سے بچنے کے لئے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہو:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ
وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا
رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝
(۴۱ : ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور
جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی
اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے
لئے ظلم کرنے والا ہو۔

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

یا عبادی لو ان اولکم
وآخرکم انسکم وجنکم
کانوا علی اتقیٰ قلب رجل
واحد منکم، ما زاد فی ملکی
شیئاً۔ یا عبادی، لو ان
اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم
کانوا علی افجر قلب رجل واحد
منکم ما نقص ذالك من ملکی
شیئاً۔ یا عبادی لو ان اولکم
وآخرکم وانسکم وجنکم قاموا
فی صعید واحد فسألونی فاعطیت
کل انسان مسئلته، ما
نقص ذالك مما عندی
الا کما ینقص المخیط
اذا ادخل البحر۔ یا عبادی
انما ھی اعمالکم احصیھا
لکم ثم اوفیکم ایاھا، فمن

اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان
جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام
انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں
سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری
خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے
بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو
بعد کو پیدا ہوں گے، اور تمام انس اور تمام جن،
اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب
سے زیادہ بدکار ہے۔ تو اس سے میری خداوندی
میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو!
اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا
ہوں گے۔ ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور
میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت
و بخشش کے خزانہ میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی
سوئی کے نوک کے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے اے
میرے بندو! یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لئے
انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انہی کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں

وجد خیرا فلیحمد اللہ، و
من وجد غیر ذالك فلا یلوا
من الّا نفسہ (مسلم بن ابی ذرؓ)

واپس دے دیتا ہوں۔ پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیئے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے۔ اور جس کسی کو برائی پیش آئے تو چاہیئے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے!

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ خود قرآن نے بھی تو جا بجا خدا کی خوشنودی اور ناراضمندی کا ذکر کیا کرے؛ بلاشبہ کیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان کی نیک عملی کا اعلیٰ درجہ یہی قرار دیتا ہے کہ جو کچھ کرے، صرف اللہ کی خوشنودی ہی کے لئے کرے۔ لیکن خدا کے جس رضا و غضب کا وہ اثبات کرتا ہے۔ وہ جزا و سزا کی علت نہیں بلکہ جزا و سزا کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور ناراضی کا نتیجہ ہے۔ نیک و بد اعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے۔ جزا و سزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا نیک عملی سے خوشنود ہوتا ہے۔ بد عملی ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قدیم اعتقاد سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ یکسر متضاد ہے۔

بہر حال جزا و سزا کی اس حقیقت کے لئے الدِّین کا لفظ نہایت موزوں لفظ ہے۔ اور ان تمام گمراہیوں کی راہ بند کر دیتا ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سورۂ فاتحہ میں مجرد اس لفظ کے استعمال نے جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکارا کر دی:۔

الدّین بمعنی قانون و مذہب

ثانیاً، یہی وجہ ہے کہ مذہب اور قانون کے لئے بھی "اَلدِّین" کا لفظ استعمال کیا گیا کیوں کہ مذہب کا بنیادی اعتقاد مکافاتِ عمل کا اعتقاد ہے اور قانون کی بنیاد تعزیر و سیاست پر ہے۔ سورۂ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السّلام) نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا۔ وہاں فرمایا:۔ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (۱۲:۷۶) یہاں بادشاہ مصر کے دین سے مقصود اس کا قانون ہے۔

"مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" میں عدالتِ الٰہی کا اعلان ہے

ثالثاً، یہاں ربوبیت اور رحمت کے بعد صفاتِ قہر و جلال میں سے کسی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن کی صفت بیان کی گئی جس سے عدالتِ الٰہی کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدالت ضرور ہے۔ اور صفاتِ قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہے در اصل اسی کے مظاہر ہیں:۔

فی الحقیقت صفاتِ الٰہی کے تصور کا یہی مقام ہے جہاں فکرِ انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی یہ ظاہر ہے کہ فطرتِ کائنات، ربوبیت و رحمت کے ساتھ اپنے مجازات بھی رکھتی ہے۔ اور اگر ایک طرف اس میں پرورش و بخشش ہے تو دوسری طرف مواخذہ و مکافات بھی ہے۔ فکرِ انسانی کے لئے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ فطرت کے مجازات اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہیں یا عدل و قسط کے؟ اس کا فکرِ نارسا عدل و قسط کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اس نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اور یہیں سے خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا حالانکہ اگر وہ فطرتِ کائنات کو زیادہ قریب ہو کر دیکھ سکتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے۔ وہ قہر و غضب کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ عین مقتضاءِ رحمت ہیں۔ اگر فطرتِ کائنات میں مکافات کا مواخذہ نہ ہوتا یا تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لئے تخریب نہ ہوتی تو میزانِ عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظامِ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

کارخانۂ ہستی کے تین معنوی عناصر: ربوبیت، رحمت، عدالت

رابعًا، جس طرح کارخانۂ خلقت اپنے وجود و بقا کے لئے ربوبیت اور ربوبیت کا محتاج ہے۔ اسی طرح عدالت کا بھی محتاج ہے۔ یہی تین معنوی عنصر ہیں۔ جن سے خلقت و ہستی کا قوام ظہور میں آیا ہے۔ ربوبیت پرورش کرتی ہے۔ رحمت افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی، اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

تعمیر و تحسین کے تمام حقائق دراصل عدل و توازن کا نتیجہ ہیں

تم نے ابھی ربوبیت اور رحمت کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے اگر ایک قدم آگے بڑھو تو اسی طرح عدالت کا مقام بھی نمودار ہو جائے۔ تم دیکھو گے کہ اس کارخانۂ ہستی میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ ایجاب و تعمیر کو تم اس کو بے شمار شکلوں میں دیکھتے ہو۔ اور اس لئے بے شمار ناموں سے پکارتے ہو۔ لیکن اگر حقیقت کا سراغ لگاؤ، تو دیکھ لو کہ ایجابی حقیقت یہاں صرف ایک ہی ہے اور وہ عدل و اعتدال ہے!

عدل کے معنی ہیں برابر ہونا، کم زیادہ نہ ہونا۔ اسی لئے معاملات اور قضایا میں فیصلہ کر دینے کو عدالت کہتے ہیں کہ حاکم دو فریقوں کی باہم دگر زیادتیاں دور کر دیتا ہے۔ ترازو کی تول کو بھی معادلت کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دونوں پلّوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ یہی عدالت جب اشیاء میں نمودار ہوتی ہے۔ تو ان کی کمیت اور کیفیت میں تناسب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک جزء کا دوسرے جزء سے کمیت یا کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

اب غور کرو، کارخانۂ ہستی میں بناؤ اور خوبی کے جس قدر مظاہر ہیں، کس طرح اسی حقیقت سے ظہور میں آئے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ حکیم بتلاتا ہے کہ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے۔ اگر اس اعتدالی حالت میں ذرا بھی فتور واقع ہو جائے۔ وجود کی نمود معدوم ہو جائے۔ جسم کیا ہے؟ جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے۔ اگر اس کا کوئی ایک جزء بھی غیر معتدل ہو جائے۔ جسم کی ہیئت ترکیبی بگڑ جائے۔ صحت و تندرستی کیا ہے؟ اخلاط کا اعتدال ہے۔ جہاں اس کا قوام بگڑا، صحت انحراف ہو گیا۔ حسن و جمال کیا ہے؟ تناسب و اعتدال کی ایک کیفیت ہے۔ اگر انسان میں ہے، تو خوب صورت انسان ہے۔ نباتات میں ہے تو پھول ہے۔ عمارت میں ہے تو تاج محل ہے۔ نغمہ کی حلاوت کیا ہے؟ سروں کی ترکیب کا تناسب و اعتدال۔ اگر ایک سُر بھی بے میل ہوا، نغمے کی کیفیت جاتی رہی۔

پھر کچھ اشیاء و اجسام ہی پر موقوف نہیں۔ کارخانہ ہستی کا تمام نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت غیر موجود ہو جائے تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ نظام شمسی کا ہر کرہ اپنی اپنی جگہ معلق ہے۔ اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ذرا بھی انحراف و میلان واقع ہو؟ یہی عدالت کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑبند کر رکھا ہے۔ تمام کرے اپنی اپنی کشش رکھتے ہیں، اور ان کے مجموعی جذب و انجذاب کے توازن سے ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے، کہ ہر کرہ اپنی جگہ قائم و معلق ہے۔ اگر کوئی کرہ اس قانون عدالت سے باہر ہو جائے تو معًا دوسرے کروں سے ٹکرا جائے اور تمام نظام شمسی مختل ہو جائے۔

اعداد کے تناسب کی عظیم الشان صداقت جن پر ریاضی اور حساب کے تمام حقائق کا دارومدار

ہے۔ کیا ہے؟ یہی عدل و تعادل کی حقیقت ہے جس دن یہ حقیقت ذہن انسانی پر کھلی تھی، علوم و معارف کے تمام دروازے باز ہو گئے تھے۔

وضع میزان | چنانچہ قرآن نے اس حقیقت کی طرف جا بجا اشارات کئے ہیں:۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝ (۵۵: ۷: ۸)

اور اس نے آسمان کو بلند کر دیا اور (اجرام سماویہ کے قیام کے لئے قانونِ عدالت کا) میزان بنا دیا۔

یہ "المیزان" یعنی ترازو کیا ہے؟ تعادل و توازن کا قانون ہے۔ جو تمام اجرام سماویہ کو ان کی مقررہ جگہ میں تھامے ہوئے ہے اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے توازن کا پلہ کسی ایک طرف کو جھک پڑے اجرام سماویہ کا یہی وہ غیر مرئی ستون ہے جس کی نسبت سورۂ رعد میں فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ (۱۳: ۲)

اللہ جس نے آسمانوں کو (یعنی اجرام سماویہ کو) بغیر کسی ستون کے بلند کر دیا ہے۔ اور تم (اس کی یہ حکمت) دیکھ رہے ہو!

اور سورۂ لقمان میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ (۳۱: ۱۰)

اس نے آسمانوں کو (یعنی اجرام سماویہ کو) پیدا کر دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ عدل و تعادل کی حقیقت سمجھانے کے لئے میزان یعنی ترازو سے بہتر کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی تھی:

اسی طرح سورۂ آل عمران کی مشہور آیتِ شہادت میں قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ (۳: ۱۸) کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی کائنات خلقت میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں۔ اور اس نے قیام ہستی کے لئے یہی قانون ٹھہرا دیا ہے:۔

اعمال انسانی کا عدل و قسط پر مبنی ہونا قرآن کی اصطلاح میں عمل صالح ہے

قرآن کہتا ہے جب عدالت کا یہ قانون کائناتِ خلقت کے ہر گوشہ میں نافذ ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے افکار و اعمال کے لئے بے اثر ہو جائے؟ پس اس گوشہ میں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے۔ جو افراط و تفریط اور میل و انحراف کی جگہ فطرت کے عدل و قسط پر مبنی ہوتا ہے اور اسی کو وحی الٰہی "عمل صالح" کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اگر تعمیر و جمال کے سینکڑوں ناموں سے تمہیں مغالطہ نہیں ہوتا اور یہ بات پا لیتے ہو کہ ان سب میں اصل حقیقت ایک ہی ہے اور وہ عدالت ہے تو اس گوشہ میں ایمان و عمل کی اصطلاح سے تمہیں کیوں توحش ہو؟ اور کیوں بے تحاشا انکار کر بیٹھو؟

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳: ۸۳)

کیا لوگ یہ چاہتے ہیں اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کریں حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب اسی کے حکم کی اطاعت کر رہے ہیں خوشی سے ہو یا ناخوشی سے (کہ سب کے لئے چلنا اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون پر ہے) اور بالآخر سب

اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں!

بدعملی کے لئے قرآن کے اختیاراتِ لغویہ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بدعملی اور برائی کے لئے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں، سب ایسی ہیں کہ اگر ان کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل وتوازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ گویا قرآن کے نزدیک برائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حقیقت عدل سے انحراف ہو۔ مثلاً ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، افساد، اعتدا، عدوان، وغیرہ ذلک:

ظلم کے معنی وضعُ الشئ فی غیر موضعہٖ کے ہیں یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیئے۔ وہاں نہ ہو، بے محل ہو، تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اسی لئے قرآن نے شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہے کیوں کہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو حقیقتِ عدل کے عین منافی ہے۔

طغیان کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گذر جانا۔ دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں طغی الماء۔ ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز عین عدالت کی ضد ہے۔

اسراف سرف سے ہے، سرف کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں جہاں خرچ کرنی چاہیئے اس سے زیادہ خرچ کر دی جائے۔

تبذیر کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ خرچ کرنا ہے جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیئے "اسراف" اور تبذیر میں مقدار اور محل کا فرق ہوا۔ کھانے میں خرچ کرنا، خرچ کا صحیح محل ہے۔ لیکن اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو یہ اسراف ہوگا۔ دریا میں روپیہ پھینک دینا روپیہ خرچ کرنے کا صحیح محل نہیں ہے۔ اگر تم روپیہ پانی میں پھینک دو تو یہ فعل تبذیر ہوگا۔ دونوں صورتیں عدالت کے منافی ہیں۔ کیوں کہ حقیقتِ عدل مقدار اور محل دونوں میں تناسب چاہتی ہے۔

فساد کے معنی ہی خروج الشئ عن الاعتدال کے ہیں یعنی کسی چیز کا حالت اعتدال سے باہر ہو جانا۔

اعتداء اور **عُدوان** ایک ہی مادہ سے ہیں اور دونوں کے معنی حد سے گذر جانا ہے۔

قرآن اور صفاتِ الٰہی کا تصور

قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے، سورۂ فاتحہ اس کی سب سے پہلی رُونمائی ہے۔ ہم اس مرقع میں وہ شبیہ دیکھ لے سکتے ہیں جو قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ ربوبیت، رحمت اور عدالت کی شبیہ ہے۔ انہی تین صفتوں کے تفکر سے ہم اس کے تصورِ الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں ؛

خدا کا تصور ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ یہ بات کہ ایک مذہب کا معنوی اور نفسیاتی مزاج کیسا ہے اور وہ اپنے پیرؤوں کے لئے کس طرح کے اثرات رکھتا ہے۔ صرف یہ بات دیکھ کر معلوم کر لی جا سکتی ہے۔ کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے؟

انسان کا ابتدائی تصوّر

جب ہم انسان کے تصوراتِ الوہیت کا ان کے مختلف عہدوں میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے تغیرات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی دکھائی دیتی ہے۔ اور تعلیل و توجیہ کے عام اصول کام نہیں دیتے۔ موجوداتِ خلقت کے ہر گوشہ میں تدریجی ارتقاء (EVOLUTION) کا قانون کام کرتا رہا ہے۔ اور انسان کا جسم و دماغ بھی اس سے باہر نہیں۔ جس طرح انسان کا جسم بہ تدریج ترقی کرتا ہوا نچلی کڑیوں سے اونچی کڑیوں تک پہنچا۔ اسی طرح اس کے دماغی تصوّرات بھی نچلے درجوں سے بلند ہوتے ہوئے بہ تدریج اونچے درجوں تک پہنچے لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کے تصوّرات کا تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال اس سے بالکل برعکس رہی اور ارتقاء کی جگہ ایک طرح کے تنزّل یا ارتجاع کا قانون یہاں کام کرتا رہا۔ ہم جب ابتدائی عہد کے انسانوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ تو ہمیں ان کے قدم آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتے دکھائی دیتے ہیں!

انسانی دماغ کا سب سے زیادہ پرانا تصور جو قدامت کی تاریکی میں چمکتا ہے۔ وہ توحید کا تصور ہے۔ یعنی صرف ایک ان دیکھی اور اعلیٰ ہستی کا تصوّر جس نے انسان کو اور ان تمام چیزوں کو جنہیں وہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، پیدا کیا۔ لیکن پھر اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس جگہ سے اس کے قدم بہ تدریج پیچھے ہٹنے لگے۔ اور توحید کی جگہ آہستہ آہستہ اشراک اور تعدّدِ الٰہ کا تصور پیدا ہونے لگا یعنی اب اس ایک ہستی کے ساتھ جو سب سے بالاتر ہے۔ دوسری قوتیں بھی شریک ہونے لگیں اور ایک معبود کی جگہ بہت سے معبودوں کی چوکھٹوں پر انسان کا سر جھک گیا ؛

اگر خدا کے تصور میں وحدت کا تصوّر انسانی دماغ کا بلند تر تصور ہے۔ اور اشراک اور تعدّد کے تصورات نچلے درجے کے تصورات ہیں۔ تو ہمیں اس کا نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے کہ کوئی یہاں ابتدائی کڑی جو نمایاں ہوئی، وہ نچلے درجہ کی نہ تھی، اونچے درجے کی تھی اور اس کے بعد جو کڑیاں اُبھریں، انہوں نے بلندی کی جگہ پستی کی طرف رُخ کیا۔ گویا ارتقاء کا نام قانون یہاں بے اثر ہو گیا۔ ترقی کی جگہ رجعت کی اصل کام کرنے لگی۔

اُنیسویں صدی کے نظریے اور ارتقائی مذہب

اُنیسویں صدی کے علماء اجتماعیات کا عام نقطۂ خیال یہ تھا کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتدا ان اوہامی تصورات سے ہوئی جو اس کی ابتدائی معیشت کے طبعی تقاضوں اور

احوال وظروف کے قدرتی اثرات سے نشو و نما پانے لگے تھے۔ یہ تصورات قانونِ ارتقاء کے ماتحت درجہ بدرجہ مختلف کڑیوں سے گزرتے رہے۔ اور بالآخر انہوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک اعلیٰ ہستی اور خالقِ کل خدا کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ گویا اس سلسلۂ ارتقاء کی کڑی اوہامی تصورات تھے جن سے طرح طرح کی الٰہی قوتوں کا تصور پیدا ہوا اور پھر اسی تصور نے ترقی کرتے ہوئے خدا کے ایک توحیدی اعتقاد کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اختصار کے ساتھ یہاں ان تمام نظریوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے۔ اور وقت کے علمی حلقوں کو متاثر کیا۔

دینی عقائد اور تصورات کی تاریخ بہ حیثیت ایک مستقل شاخِ علم کے انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب انڈو جرمن قبائل (یعنی وسط ایشیا کے آریائی قبائل) اور ان کی زبانوں کی تاریخ روشنی میں آئی۔ تو ان کے دینی تصورات بھی نمایاں ہوئے اور اس طرح بحث وتنقید کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا۔ یہی میدان تھا۔ جس کے مباحث نے انیسویں صدی کے اوائل میں بحث و نظر کی ایک مستقل شاخ پیدا کر دی۔ یعنی دینی عقائد کی پیدائش اور ان کے نشو و نما کی تاریخ کا علم مدون ہونے لگا۔ اسی دور میں عام خیال یہ تھا کہ خدا پرستی کی ابتدا نیچر متھس (NATUAE-MYTHS) کے تصورات سے ہوئی۔ یعنی ان خرافاتی اساطیر سے ہوئی جو مظاہرِ فطرت کے متعلق بننا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً روشنی کی ایک مستقل ہستی کا تصور پیدا ہو گیا۔ بارش کی قوت نے ایک دیوتا کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم آریائی تصورات سے جو مظاہرِ فطرت کی پرستش پر مبنی تھے اس خیال کا مواد فراہم ہوا تھا۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف ابتدائی دور میں جب افریقہ اور امریکہ کے وحشی قبائل کے حالات روشنی میں آئے تو ان کے دینی تصورات کی تحقیقات نے ایک نئے نظریئے کا سامان فراہم کر دیا۔ سنہ۱۷۶۰ء میں وہ برزدسے (DE-BROSSES) نے انہی وحشی قبائل کے تصورات سے فیٹش ورشپ (FSTISH-WORSHIP) کا استنباط کیا تھا۔ یعنی ایسی اشیاء کی پرستش کا جن سے کسی جنی روح کی وابستگی یقین کی جاتی تھی۔ اب پھر ۱۸۵۱ء میں اے کامٹ (COMATO) نے اسی پرستش سے خدا پرستی کی پیدائش کا نظریہ اختیار کیا۔ اور سر جان لبک نے (جو آگے چل کر لارڈ اویبری کے لقب سے مشہور ہوا) اسے مزید بحث و نظر کا جامہ پہنایا۔ اس نظریئے کا اس عہد میں عام طور پر استقبال کیا گیا تھا اور وقت کے علمی حلقوں کی قبولیت اس نے حاصل کر لی تھی۔

تقریباً اسی عہد میں مین اِزم (MANISM) یعنی اجداد پرستی کے نظریئے نے سر اٹھایا۔ اس نظریئے کی بنیاد اس قیاس پر رکھی گئی تھی۔ کہ انسان کے آباؤ اجداد کی محبت و عظمت نے پہلے ان کی پرستش کی راہ دکھائی۔ پھر اسی پرستش نے قانونِ ارتقاء کے ماتحت ترقی کر کے خدا پرستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ صحرانشین اور چراگاہوں کی جستجو کرنے والے قبیلوں کے ابتدائی تصورات میں اجداد پرستی کا ذہنی مواد موجود تھا۔ چین کی قدیم تاریخ میں بھی اس پرستش کا سراغ بہت دور تک ملنے لگا تھا۔ اس نئے نظریئے کے لئے ضروری مواد فراہم ہو گیا، اور سنہ۱۸۷۶ء میں جب ہربرٹ اسپنسر نے اپنے آسیبی نظریئے (GHOST-THEDRY) کی بنیاد اسی تخیل پر استوار کی۔ تو وقت کے فلسفیوں اور اجتماعیات کے حلقے میں اس نے فوراً مقبولیت پیدا کر لی۔

اسی عہد میں ایک دوسرا نظریہ بھی بروئے کار آیا۔ اور اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ ای۔ بی ٹیلر کا اینیمزم (ANIMISM) کا نظریہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب پری مے ٹیو کلچر شائع کی۔ اور اس میں دینی عقائد کی کم از کم تعریف اینیمزم کے ذریعہ کی۔ اینیمزم سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے تصورات میں اس کی جسمانی زندگی کے علاوہ ایک مستقل روحانی زندگی کا تصور بھی پیدا ہو جائے۔ اس مستقل روحانی زندگی کا تصور، ٹیلر کے نزدیک خدا پرستی اور دینی عقائد کا بنیادی مادہ تھا۔ اسی لئے مادہ نے نشو و نما پاکر خدا کی ہستی کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ غالباً دینی عقائد کی پیدائش کے تمام نظریوں میں یہ پہلا نظریہ ہے جو علمی طریقہ پر پوری طرح مرتب کیا گیا۔ اور بحث و نظر کے تمام اطراف و جوانب منظم اور آراستہ کئے گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے تمام علمی حلقوں پر اس نظریئے نے ایک خاص اثر ڈالا تھا اور عام طور پر اسے ایک مقررہ اور طے شدہ اصل کی شکل میں پیش کیا جانے لگا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک اس نظریئے کا یہ اقتدار بلا استثنا قائم رہا۔

اسی اثناء میں مصر، بابل، اور اشوریا کے قدیم آثار و کتبات کے حل سے تاریخ قدیم کا ایک بالکل نیا میدان روشنی میں آنے لگا تھا اور ان آثار کے مباحث نے مستقل علوم کی حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس نئے مواد نے مظاہر فطرت کی پرستش کی۔ اصل کو از سر نو اہمیت دے کر ابھار تصورات نمایاں کرتے تھے۔ چنانچہ اب پھر ایک نیا مذہب (اسکول) پیدا ہو گیا جو خدا پرستی کی پیدائش کی ابتدائی بنیاد مظاہر فطرت کے تاثرات کو قرار دیتا تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اجرام سماوی کے تاثرات پر زور دیتا تھا۔ اس نظریئے کے حامیوں نے اینیمزم کی مخالفت کی اور ایسٹرل اینڈ نیچر میتھالوجسٹ (ASTRAL AND NATURE MYTHOLOGISTS) کے نام سے مشہور ہوئے۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف آخری حصے میں جبکہ یہ تمام نظریئے سر اٹھا رہے تھے۔ دوسری طرف ایک خاص علمی حلقہ ایک دوسرے نظریئے کی بنیادیں بھی چن رہا تھا۔ اس نظریئے کا مواد قدیم ترین تمدنی عہد کے شکار پیشہ قبائل کے تصورات نے بہم پہنچایا تھا۔ جن کے حالات اب تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں رہے تھے۔ یہ نظریہ ٹوٹمزم (TOTEMISM) کے نام سے مشہور ہوا اور بہت جلد اس نے وقت کے علمی حلقوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ٹوٹمزم سے مقصود مختلف اشیاء اور جانوروں کے وہ انتسابات ہیں۔ جو جمعیت بشری کی ابتدائی قبائلی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اور پھر کچھ عرصے کے بعد ان اشیاء اور جانوروں کا غیر معمولی احترام کیا جانے لگا تھا۔ اس نظریئے کی رو سے خیال کیا گیا کہ ہندوستان کی گائے مصر کا مگرمچھ، اور بیل، شمالی خطوں کا ریچھ اور صحرا نشین قبائل کا سفید بچھڑا، در اصل ٹوٹمزم ہی کے بقایا ہیں۔ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رابرٹسن سمتھ نے اس نظریئے کا اعلان کیا تھا۔ پھر وقت کے دوسرے نظّار نے بھی اسی رخ پر قدم اٹھایا۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نظریئے کی مقبولیت مجروح ہونا شروع ہو گئی۔ پروفیسر جے۔ جی فریزر کا جمع کیا ہوا مواد جب منظر عام پر آیا تو معلوم ہوا کہ ٹوٹمزم کے تصورات نہ تو دینی تصورات کی نوعیت رکھتے تھے۔ نہ دینی تصورات کا مبدء بننے کی ان میں صلاحیت تھی۔ ان کی اصلی نوعیت زیادہ سے زیادہ ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ جس کے ساتھ طرح طرح کے تصورات کا ایک سلسلہ وابستہ

ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں اس سلسلہ میں اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

مگر اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور گوشہ بھی نمایاں ہوا تھا۔ فریزر نے ٹوٹمزم کے تصورات میں ایک خاص قسم ایسی بھی پائی تھی جس میں دینی عقائد کا ابتدائی مواد بننے کی زیادہ صلاحیت دکھائی دیتی تھی یعنی وہ قسم جو جادو کے اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے۔ بحث و نظر کے اس گوشے نے مفکروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور جادو کا نظریہ علمی حلقوں میں روشن ہو گیا ۱۸۹۲ء میں ایک امریکی عالم جے۔ ایچ کینگ اس پہلو پر توجہ دلا چکا تھا۔ اب بیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں بہ یک وقت جرمنی، انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے علمی حلقوں سے اس کی بازگشت شروع ہو گئی اور اینمزم کے خلاف ردِ عمل کام کرنے لگا۔ اب یہ خیال عام طور پر پھیل گیا۔ کہ اینمزم کے تصورات سے پیشتر بھی انسانی تصوّرات کا ایک دور رہ چکا ہے اور یہ ماقبل اینمزم (PREANIMISM) دور، جادو کے تصورات کا دور تھا۔ اسی جادو کے اعمال کے عقیدے نے آگے چل کر روحانی عقاید کی شکل اختیار کر لی۔ اور خدا پرستی اور دینی عقاید کے مبادیات پیدا ہو گئے۔

اب جادو کا نظریہ ایک عام مقبول نظریہ بن گیا۔ اور پچھلے نظریئے اپنی جگہ کھونے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں آر۔ آر میرٹ نے، ۱۹۰۲ء میں ہیوٹ نے، ۱۹۰۴ء میں کے۔ پریوس نے، ۱۹۰۷ء میں اے وائر کنڈٹ نے، اور ۱۹۰۸ء میں ای۔ اس۔ ہارٹ لینڈ نے اسی نظریئے پر اپنے بحث و فکر کی تمام دیواریں اٹھائیں اور اسے دور تک پھیلاتے چلے گئے۔ سب سے زیادہ حصہ اس میں فرانس کے علماء اجتماعیات کے اس طبقہ نے لیا جو دورکیم (DURKHEIM) کے مسلکِ نظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس طبقہ کا زعیم پہلے ایچ۔ ہیوبرٹ اور ام۔ ماس تھا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں خود دورکیم آگے بڑھا۔ اور اس نظریئے کا سب سے بڑا علم بردار بن گیا۔ اس گروہ کی رائے میں ٹوٹمزم اور جادو کے تصورات کا مرکب مجموعہ جیسا کہ وسط آسٹریلیا کے قبائل کے اوہام میں پایا جاتا ہے۔ جمعیت بشری کے دینی تصورات کا اصلی مبدء تھا۔ قانون ارتقاء کے ماتحت انہی تصورات نے خدا پرستی کے عقاید کی ترقی یافتہ شکل پیدا کر لی۔

اس زمانہ کے چند سال بعد بعض پروٹسٹنٹ علماء نے جو دینی عقائد کے نفسیاتی مطالعہ میں مشغول تھے۔ مسئلے پر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی۔ اور اس نظریئے کی حمایت شروع کر دی وہ اس طرف گئے کہ خدا پرستی کے عقیدے کا مبدء ہمیں مذہب اور سحر کاری، دونوں کے مرکب تصورات میں ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس جماعت کا پیش رو آرچ بشپ سوڈربلوم (SOBERBLOM.) تھا۔ جس کے باعث ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئے۔

اس کے بعد کا زمانہ پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا۔ جو بیسویں صدی کا ایک دور ختم کر کے دوسرے دور کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس نئے دور نے جہاں علم و نظر کے بہت سے گوشوں کو انقلابی تغیرات سے آشنا کیا۔ وہاں علم کی اس شاخ میں بھی ایک نیا انقلابی دور شروع ہو گیا۔

یہ تمام پچھلے نظریئے مادی مذہب ارتقاء (MATERIALISTIC EVOLUTIONISM) کی اصل پر مبنی تھے۔ ان سب کے اندر یہ بنیادی اصل کام کر رہی تھی کہ اجسام و مواد کی طرح انسان کا دینی عقیدہ بھی بتدریج نچلی کڑیوں سے ترقی کرتا ہوا اعلیٰ کڑیوں تک پہنچا ہے۔ اور خدا پرستی کے عقیدہ میں توحید (MONOTHEISM) کا تصور ایک طول طویل سلسلہ ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

انیسویں صدی کا نصف آخر ڈارونزم کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا۔ اور بجنس ویلز، اسپنسر سے اسے اپنے فلسفیانہ مباحث سے انسانی فکر و عمل کے تمام دائروں میں پھیلا دیا تھا۔ قدرتی طور پر خدا کے اعتقاد کی پیدائش کا مسئلہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ اور نظر و بحث کے جتنے قدم اٹھے وہ اسی راہ پر گامزن ہونے لگے ::

مذہب ارتقاء کا خاتمہ اور زمانہ حال کی تحقیقات

لیکن ابھی بیسویں صدی پہلے اپنے انقلاب انگیز انکشافوں میں بہت آگے نہیں بڑھی تھی کہ ان تمام نظریوں کی عمارتیں متزلزل ہونا شروع ہو گئیں اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کے عہد نے تو انہیں یک قلم منہدم کر دیا۔ اب تمام اہلِ نظر بالاتفاق دیکھنے لگے کہ اس راہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے تھے، وہ سرے سے اپنی بنیاد ہی میں غلط تھے۔ کیونکہ ان سب کی بنیاد قانون ارتقار کی اصل پر رکھی گئی تھی اور ارتقائی اصل کی رہنمائی یہاں سودمند ہونے کی جگہ گمراہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اب انہیں ٹھوس اور ناقابل انکار تاریخی شواہد کی روشنی میں صاف صاف نظر آ گیا۔ کہ انسان کے دینی عقاید کی جس نوعیت کو انہوں نے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قرار دیا تھا۔ وہ بعد کے زمانوں کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ جمعیت بشری کی سب سے زیادہ پرانی متاع ہے۔ مظاہر فطرت کی پرستش، حیوانی انتسابات کے تصورات، اجداد پرستی کی رسوم، اور جادو کے توہمات کی اشاعت سے بھی بہت پہلے جو تصور انسانی دل و دماغ کے افق پر طلوع ہوا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ ترین ہستی کی موجودگی کا بے لاگ تصور تھا یعنی خدا کی ہستی کا توحیدی اعتقاد تھا۔

چنانچہ اب بحث و نظر کے اس گوشہ میں ارتقائی مذہب کا یک قلم خاتمہ ہو چکا ہے۔

ڈبلیو شمٹ (SCHMIAT) پروفیسر وائنا یونیورسٹی جنہوں نے اس موضوع پر زمانۂ حال کی سب سے بہتر کتاب لکھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "علم شعوب و قبائل انسانی کے پورے میدان میں اب
> چانا ارتقائی مذہب یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے
> نشو و نما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوشنما سلسلہ جو اس مذہب
> نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کر دیا تھا۔ اب ٹکڑے
> ٹکڑے ہو گیا اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر
> پھینک دیا ہے[۱]"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ انسان کے ابتدائی عمران و تمدن کے تصور کی "اعلیٰ ترین ہستی" فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا۔ وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے۔ کہ ایک سرسری نظر تحقیق بھی اس کے لئے کفایت کرے گی۔ نسلِ انسانی کے قدیم پستہ قد قبائل میں سے اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کے جو حالات روشنی میں آئے ہیں۔ اور کرنائی، کلین اور جنوب مشرقی آسٹریلیا کے یائن قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریخی مواد مہیا ہوا

---

[۱] دی اوریجن اینڈ گروتھ آف ریلجن صفحہ ۸

ہے ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے۔ ارکٹیک تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے قبائل کے دینی تصورات کی چھان بین نے بھی بالآخر اسی نتیجہ کو نمایاں کیا۔

زمانۂ حال کے نظّار نے اب اس مسئلہ کا موسوعاتی (PANTOLOGIC) طریق نظر سے مطالعہ کیا ہے اور قدیم معلومات و مباحث کی تمام شاخیں جمع کر کے مجموعی نتائج نکالے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس سلسلہ کی بعض جدید تحقیقات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے کیوں کہ ابھی وہ اس درجہ شائع نہیں ہوئی ہیں۔ کہ عام طور پر نظر و مطالعہ میں آچکی ہوں۔

آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات

آسٹریلیا اور جزائر بحر محیط کے وحشی قبائل ایک غیر معین قدامت سے اپنی ابتدائی ذہنی طفولیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ زندگی و معیشت کی وہ تمام ترقی یافتہ کڑیاں جو عام طور پر انسانی جماعتوں کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ مربوط کرتی ہیں۔ یہاں یکسر مفقود رہیں۔ ابتدائی عہد کی بشری جمعیت کے تمام جسمانی اور دماغی خصائص ان کی قبائلی زندگی میں دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کے تصور اس درجہ محدود تھے کہ اوہام و خرافات میں بھی کسی طرح کا ارتقائی نظم نہیں پایا جاتا تاہم ان کا ایک اعتقادی تصور بالکل واضح تھا۔ ایک بالاتر ہستی ہے جس نے ان کی زمین اور ان کا آسمان پیدا کیا۔ اور ان کا مرنا اور جینا اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ مصر کے قدیم ترین باشندوں کی صدائیں آٹھ ہزار برس پیشتر تک کی ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں۔ قدیم مصری تصورات کا پورا سلسلہ اپنی عہد بعہد کی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے سامنے اُبھر آیا ہے۔ ہمیں صاف نظر آ رہا ہے۔ کہ ایک خدا کی پرستش کا تصور اس سلسلہ میں بعد کو نہیں ابھرا، بلکہ سلسلہ کی سب سے زیادہ پرانی کڑی ہے۔ مصر کے وہ تمام معبود جن کے مرقعوں سے اس کے مشہور عالم ہیکلوں اور مناروں کی دیواریں منقش کی گئی ہیں اس قدیم ترین عہد میں اپنی کوئی نمود نہیں رکھتے تھے۔ جب صرف ایک "واد میرینہ" کی ان دیکھی ہستی کا اعتقاد دریائے نیل کی تمام آباد وادیوں پر چھایا ہوا تھا۔[1]

دجلہ و فرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصوّر

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد عراق کے مختلف حصوں میں کھدائی کی جو نئی مہمیں شروع کی گئی تھیں اور جو موجودہ جنگ کی وجہ سے ناتمام رہ گئیں ان کے انکشافات نے اس مسئلہ کے لئے نئی روشنیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اب اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاتا۔ کہ دریائے نیل کی طرح دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بھی جب انسان نے پہلے پہل اپنے خدا کو پکارا تو وہ بہت سی ہستیوں میں بٹا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی ان دیکھی ہستی کی صورت میں نمایاں ہوا تھا۔ کالڈیا کے سومیری اور اکاوی قبائل جن انسانی نسلوں کے وارث ہوئے تھے وہ "شمس" یعنی سورج اور "ننار" یعنی چاند کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس، ایک ہی لازوال ہستی کی، جس نے سورج اور چاند

[1] "مردہ کی کتاب" قدیم مصری تصورات کا سب سے زیادہ مرتب اور منضبط نوشتہ ہے۔ مصریات کے مشہور محقق ڈاکٹر بج (BUDGE) کی رائے میں یہ سب سے زیادہ قدیم فکری مواد ہے جو مصری آثار نے ہمارے حوالہ کیا ہے۔ یہ خود اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا مصری تمدن ہے۔ لیکن جو تصورات اس میں جمع کئے گئے ہیں۔ وہ مصری تمدن سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ اتنے قدیم ہیں کہ ہم ان کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتی اس نوشتہ میں "واد میرینہ" کے یہ صفات بھی ملتے ہیں۔ معبود اعظم، الخیر عاذلی پادشاہ۔ آخرت کا مالک۔

اور تمام چمکدار ستاروں کو بنایا ہے۔

موہنجو دارو کا خدائے واحد "اون"

ہندوستان میں "موہنجو دارو" کے آثار ہمیں آریاؤں کے عہد ورود سے آگے لے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعۂ و تحقیق کا کام ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ تاہم ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے۔ اس قدیم ترین انسانی بستی کے باشندوں کا بنیادی تصور توحید الٰہی کا تصور تھا۔ اصنام پرستانہ تصور نہ تھا۔ وہ اپنے یگانہ خدا کو "اون" کے نام سے پکارتے تھے۔ جس کی مشابہت ہمیں سنسکرت کے لفظ "اندران" میں مل جاتی ہے۔ اس یگانہ ہستی کی حکومت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ طاقت کی تمام ہستیاں اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ اس کی صنعت "دید وکن" ہے۔ یعنی ایسی ہستی جس کی آنکھیں کبھی غافل نہیں ہوسکتیں۔ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم!

"اللہ" کی یگانہ اور ان دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصور

سامی قبائل کا اصلی سرچشمہ صحرائے عرب کے بعض شاداب علاقے تھے۔ جب اس چشمہ میں نسلِ انسانی کا پانی بہت بڑھ جاتا تو اطراف میں پھیلنے لگتا یعنی قبائل کے جھتے عرب سے نکل کر اطراف و جوانب کے ملکوں میں منتشر ہونے لگتے اور پھر چند صدیوں کے بعد نیا رنگ روپ، اور نئے نام اختیار کر لیتے ہیں۔ شاید انسانی قبائل کا انشعاب کرۂ ارضی کے دو مختلف حصوں میں بیک وقت جاری رہا اور زمانۂ مابعد کی مختلف قوموں اور تمدنوں کا بنیادی مبدء بنا۔ صحرائے گوبی کے سرچشمے سے وہ قبائل نکلے، جو ہندی، یورپی (انڈو یورپین) آریاؤں کے نام سے پکارے گئے۔ صحرائے عرب سے وہ قبائل نکلے جن کا پہلا نام سامی پڑا اور پھر یہ نام بے شمار ناموں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔ تاریخ کی موجودہ معلومات اس حد تک پہنچ کر رک گئی ہے۔ اور آگے کی خبر نہیں رکھتی۔

عرب قبائل کا یہ انشعاب بہ تدریج مغربی ایشیا اور قریبی افریقہ کے تمام دور دراز حصوں تک پھیل گیا تھا۔ فلسطین، شام، مصر، نوبیا، عراق اور سواحل خلیج فارس۔ سب ان کے دائرہ انشعاب میں آگئے تھے۔ عاد، ثمود، عمالقہ، ہکوس، موابی، آشوری، آکاوی، سومیری، عیلامی، آرامی، اور عبرانی وغیرہم مختلف مقاموں، اور مختلف عہدوں کی قوموں کے نام ہیں۔ مگر در اصل سب ایک ہی قبائلی سرچشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ یعنی عرب سے۔

اب جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے جو ان تمام قوموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے۔ یعنی ان تمام قوموں میں ایک ان دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا۔ اور وہ "ال" "الاہ" یا "اللہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "الاہ" ہے جس نے کہیں "ایل" کی صورت اختیار کی، کہیں "الوہ" کی اور کہیں "الاہیا" کی۔

سرحدِ حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راس شمر کے جو آثار گزشتہ جنگ کے بعد منکشف ہوئے، ان سے یہ حقیقت اور زیادہ آشکارا ہوگئی ہے مگر یہ موقعہ تفصیل کا نہیں۔

انسان کی پہلی راہ ہدایت کی تھی، گمراہی بعد کو آئی

بہر حال، بیسویں صدی کی جستجو اب ہمیں جس طرف لے جا رہی ہے۔ وہ انسان کا قدیم ترین توحیدی اور غیر اصنامی اعتقاد ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تصورات کی کوئی بات پرانی نہیں۔ اس نے اپنے عہد طفولیت میں ہوش و خرد کی آنکھیں جونہی کھولی تھیں، ایک یگانہ ہستی کا اعتقاد اپنے اندر موجود پایا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قدم بھٹکنے لگے۔ اور بیرونی اثرات کی جولانیاں اسے نئی نئی صورتوں اور نئے نئے ڈھنگوں سے آشنا کرنے لگیں۔ اب ایک سے زیادہ ما فوق الفطرت طاقتوں

کا تصور نشو و نما پانے لگا۔ اور مظاہر فطرت کے بے شمار جلوے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ پرستش کی ایسی چوکھٹیں بننا شروع ہو گئیں جنہیں اس کی جبینِ نیاز چھو سکتی تھی۔ اور تصورات کی ایسی صورتیں ابھرنے لگیں جو اس کے دیدۂ صورت پرست کے سامنے نمایاں ہو سکتی تھیں۔ یہیں اسے ٹھوکر لگی لیکن راہ ایسی تھی کہ ٹھوکر سے بچ بھی نہیں سکتا تھا:۔

کند کوتہ، و بازوے سست، و بام بلند
بمن حوالۂ و فہمیدہ ہم گنہ گیرند

پس معلوم ہوا کہ اس راہ میں ٹھوکر بعد کو لگی۔ پہلی حالت ٹھوکر کی نہ تھی۔ راہ راست پر گام فرسائیوں کی تھی۔

من ملک بودم و فردوس بریں جائم بود
آدم آورد دریں خانہ خراب آبادم!

اگر اس صورتِ حال کو گمراہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تو ماننا پڑے گا کہ پہلی حالت جو انسان کو پیش آئی تھی وہ گمراہی کی نہ تھی، ہدایت کی تھی، اس نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی۔

دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن کا اعلان

زمانۂ حال کی علمی تحقیقات کا یہ نتیجہ ادیانِ عالم کے مقدس نوشتوں کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ مصر، یونان، کالڈیا، ہندوستان، چین، ایران، سب کی مذہبی روائتیں ایک ایسے ابتدائی عہد کی خبر دیتی ہیں۔ جب نوعِ انسانی گمراہی اور غمناکی سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ اور فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ افلاطون نے کریطیاس (GRITIAS) میں آبادیٔ عالم کی جو حکایت کی تھی۔ اس میں اس اعتقاد کی پوری جھلک موجود ہے۔ اور طیماوس (TIMAEUS) کی حکایت جو ایک مصری پجاری کی زبانی ہے۔ مصری روایت کی خبر دیتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش نے آدم کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس قصہ میں آدم کی پہلی زندگی ہدایت کی بہشتی زندگی تھی۔ پھر لغزش ہوئی اور بہشتی زندگی مفقود ہو گئی۔ اس قصہ میں بھی یہی اصل کام کر رہی ہے کہ یہاں پہلا دور فطری ہدایت کا تھا۔ انحراف و گمراہی کی راہیں بعد کو کھلیں۔ قرآن نے تو صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ؕ
(۱۰ : ۱۹)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

دوسری جگہ مزید تشریح کی:

وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ
(۲ : ۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا۔ (یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے۔ پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے) پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کئے۔ وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوش خبری دیتے تھے۔ بدعملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کئے۔ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں۔ ان کا فیصلہ کر دیں۔

ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں مگر اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں مدد دیتا ہے

پس خدا کی ہستی کے عقیدے کے بارے میں انیسویں صدی کا ارتقائی نظریہ اب اپنی علمی اہمیت کھوچکا ہے اور بحث و نظر میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسان کے ان تصوروں کا تعلق ہے۔ جو خدا کی صفات کی نقش آرائیاں کرتے رہے۔ ہمیں ارتقائی نقطہ خیال سے ضرور مدد ملتی ہے۔ کیوں کہ بلاشبہ یہاں تصورات کے نشوو ارتقاء کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے۔ جس کی ارتقائی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ کی جاسکتی ہیں۔ اور نچلے درجوں سے اونچے درجہ کی طرف ہم بڑھ سکتے ہیں۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کے ذہن کی پیداوار نہ تھا کہ ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتا رہتا وہ اس کی فطرت کا ایک وجدانی احساس تھا۔ اور وجدانی احساسات میں نہ تو ذہن و فکر کے مؤثرات مداخلت کر سکتے ہیں، نہ باہر کے اثرات سے ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔

لیکن انسان کی عقل، ذات مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ جب کسی چیز کا تصور کرنا چاہتی ہے۔ تو گو تصور ذات کا کرنا چاہیئے۔ لیکن تصور میں صفات و عوارض ہی آتے ہیں۔ اور صفات ہی کے جمع و تفرقہ سے وہ ہر چیز کا تصور آراستہ کرتی ہے۔ پس جب فطرت کے اندرونی جذبہ نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا۔ تو ذہن نے چاہا، اس کا تصور آراستہ کرے۔ لیکن جب تصور کیا تو یہ اس کی ذات کا تصور نہ تھا۔ اس کی صفات کا تصور تھا۔ اور صفات میں بھی انہی صفات کا۔ جن کا ذہن انسانی تخیل کر سکا تھا۔ یہیں سے خدا پرستی کے فطری جذبہ میں ذہن و فکر کی مداخلت شروع ہوگئی۔

عقلِ انسانی کی درماندگی اور صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی

عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ اس لئے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ وہ جب کسی اَن دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصور کرے گی تو ناگزیر ہے۔ کہ تصور میں وہی صفات آئیں جنہیں وہ دیکھتی اور سنتی ہے۔ اور جو اس کے حاسۂ ذوق و لمس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اس کے ذہن و تفکر کی جتنی بھی رسائی ہے۔ بیک دفعہ ظہور میں نہیں آئی ہے۔ بلکہ ایک طول طویل عرصہ کے نشوو ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتداء میں اس کا ذہن عہد طفولیت میں تھا۔ اس لئے اس کے تصورات بھی اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ پھر جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں ترقی ہوتی گئی۔ اس کا ذہن بھی ترقی کرتا گیا۔ اور ذہن کی ترقی و تنزگیہ کے ساتھ اس کے تصورات میں بھی شائستگی اور بلندی آتی گئی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی تو ہمیشہ ویسی ہی بنائی جیسی صورت خود اس نے اور اس کے احوال وظروف نے پیدا کر لی تھی۔ جوں جوں اس کا معیار فکر بدلتا گیا۔ وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اسے اپنے آئینہ تفکر میں ایک صورت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا۔ یہ اس کے معبود کی صورت ہے، حالانکہ وہ اس کے معبود کی صورت نہ تھی۔ خود اسی کے ذہن و صفات کا عکس تھا!

فکر انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یہی ہے جو اس راہ میں پیش آئی!

حرم جویاں درے را می‌پرستند | فقیہاں دفترے را می‌پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد | کہ یاراں دیگرے را می‌پرستند

یہی درماندگی ہے جس سے نجات دلانے کے لئے وحی الٰہی کی ہدایت ہمیشہ نمودار ہوتی رہی۔

انبیاء کرام (علیہم السلام) کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خدا پرستی کی تعلیم ویسی ہی شکل و اسلوب میں دی جیسی شکل و اسلوب کے فہم و تحمل کی استعداد مخاطبوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجمع انسانی کے معلم و مربی تھے۔ اور معلم کا فرض ہے کہ متعلموں میں جس درجہ کی استعداد پائی جائے۔ اسی درجہ کا سبق بھی دے۔ پس انبیاء کرام نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لئے جو پیرایہ تعلیم اختیار کیا وہ اس سلسلۂ ارتقاء سے باہر نہ تھا۔ بلکہ اسی کی مختلف کڑیاں مہیا کرتا ہے۔

ارتقاءِ تصور کے نقاط ثلاثہ

اس سلسلہ کی تمام کڑیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں اور ان کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی بے شمار نوعتیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے اور انہی سے اس سلسلہ کی ہدایت و نہایت معلوم کی جاسکتی ہے۔

(۱) تجسّم[ف] سے تنزیہہ کی طرف

(۲) تعدد و اشراک (POLYTHEISM) سے توحید (MONOTHEISM) کی طرف

(۳) صفاتِ قہر و جلال سے صفاتِ رحمت و جمال کی طرف۔

یعنی تجسم اور صفات نہریہ کا تصور اس کا ابتدائی درجہ ہے اور تنزیہ اور صفاتِ رحمت و جمال سے اتصاف، اعلیٰ و کامل درجہ، جو تصور جس قدر ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ اتنا ہی مجسّم اور صفاتِ قہریہ کا عنصر اس میں زیادہ ہے جو تصور جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اتنا ہی زیادہ منزہ اور صفاتِ رحمت و جلال سے متصف ہے ؛

انسان کا تصور صفاتِ قہریہ کے تاثر سے کیوں شروع ہوا؟

انسان کا تصوّر صفات قہریہ کے تخیل سے کیوں شروع ہوا؟

اس کی علت واضح ہے۔ فطرت کائنات کی تعمیر، تخریب کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی فکر کی طفولیت تعمیر کا حسن نہ دیکھ سکی، تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی، تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لئے فہم و بصیرت کی دور رس نگاہ مطلوب تھی اور وہ ابھی اس کی آنکھوں نے پیدا نہیں کی تھی۔

دنیا میں ہر چیز کی طرح ہر فعل کی نوعیت بھی اپنا مزاج رکھتی ہے۔ بناؤ ایک ایسی حالت ہے جس کا مزاج سرتاسر سکون اور خاموشی ہے۔ اور بگاڑ ایک ایسی حالت ہے کہ اس کا مزاج سرتاسر شورش اور ہولناکی ہے۔ بناؤ ایجاب ہے۔ نظم ہے، جمع و ترتیب ہے، بگاڑ سلب ہے، برہمی ہے، تفرقہ و اختلال ہے۔ جمع و حالت ہی سکون کی حالت ہوتی ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و انفجار ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو تمہیں کوئی شورش محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب گرتی ہے۔ تو دھماکہ ہوتا ہے۔ اور تم بے اختیار چونک اٹھتے ہو۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جوانی ہے۔ طبیعت سلبی افعال سے فوراً متاثر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کی نمود میں شورش اور ہولناکی ہے۔ لیکن ایجابی افعال سے متاثر ہونے میں دیر لگاتی ہے۔ کیوں کہ ان کا حسن و جمال یکایک مشاہدہ میں نہیں آجاتا

[ف] تجسم سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی نسبت ایسا تصور قائم کرنا کہ وہ مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہے۔ تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ ایسی صفات تجویز کرنی جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے جو اسے مخلوقات سے مشابہ کرتی ہوں اسے مبرا یقین کرنا۔ انگریزی میں تجسم کے لئے ان تھروپو مارفزم (ANTHROPOMORPHISM) اور تشبیہ کے لئے "ان تھراپو فیو ازم" (ANTHROPOPHUISM) کی مصطلحات استعمال کرتے ہیں ۱۲

اور ان کا مزاج شورش کی جگہ خاموشی اور سکون ہے۔

فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہر کا حسن و جمال، انسان پر شیفتگی سے پہلے دہشت طاری ہوئی

اسی بنا پر عقل انسانی نے جب صفات الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی، تو فطرت کائنات کے سلبی مظاہر کی دہشت سے متاثر ہوگئی۔ کیونکہ نمایاں اور پرشور تھے۔ اور ایجابی و تعمیری حقیقت سے متاثر ہونے میں بہت دیر لگ گئی۔ کیونکہ ان میں شورش اور ہنگامہ نہ تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب، سمندر کا تلاطم، ان تمام سلبی مظاہر میں اس کے لئے رعب و ہیبت تھی اور اسی ہیبت کے اندر وہ ایک غضب ناک خدا کی ڈراؤنی صورت دیکھنے لگا تھا اسے بجلی کی کڑک میں کوئی حسن محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بادلوں کی طرح میں کوئی شان محبوبیت نہیں پا سکتا تھا۔ وہ آتش فشاں پہاڑوں کی سنگ باری سے پیار نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کی عقل ابھی خدا کے انہی کاموں سے آشنا ہوئی تھی!

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی کہ اُنس و محبت کی جگہ خوف و دہشت کے جذبات برانگیختہ ہوتے۔ وہ کمزور اور نہتا تھا اور دنیا کی ہر چیز اسے دشمنی اور ہلاکت پہ تلی نظر آتی تھی دلدل کے مچھروں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے۔ درندوں کے حملوں سے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا تھا۔ سر پہ سورج کی تپش بے پناہ تھی۔ اور چاروں طرف موسم کے اثرات ہولناک تھے۔ غرضیکہ اس کی زندگی سرتاسر جنگ اور محنت تھی۔ اور اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کا ذہن، خدا کا تصور کرتے ہوئے، خدا کی ہلاکت آفرینیوں کی طرف جاتا، رحمت و فیضان کا ادراک نہ کر سکتا۔

بالآخر صفاتِ رحمت و جمال کا اشتمال

لیکن جوں جوں اس میں اور اس کے ماحول میں تبدیلی ہوتی گئی اس کے تصور میں بھی یاس و دہشت کی جگہ امید و رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ معبودیت کے تصور میں صفات رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی۔ جیسی صفات قہر و جلال کے لئے تھی۔ چنانچہ اگر قدیم اقوام کے اصنام پرستانہ تصورات کا مطالعہ کریں۔ تو ہم دیکھیں گے۔ کہ ان کی ابتداء ہر جگہ صفات قہر و غضب کے تصور ہی سے ہوئی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ رحمت و جمال کی طرف قدم اٹھا ہے۔ آخری کڑیاں وہ نظر آئیں گی جن میں قہر و غضب کے ساتھ رحمت و جمال کا تصور ابھی مساویانہ حیثیت سے قائم ہوگیا ہے، مثلاً قہر و ہلاکت کے دیوتاؤں اور قوتوں کے ساتھ زندگی، رزق، دولت، اور حسن و علم کے دیوتاؤں کی بھی پرستش شروع ہوگئی ہے۔ یونان کا علم الاصنام اپنے لطافتِ تخیل کے لحاظ سے تمام اصنامی تخیلات میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی پرستش کے بھی قدیم معبود وہی تھے۔ جو قہر و غضب کی خوفناک قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اس وقت تک زندگی اور بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

ظہورِ قرآن کے وقت دنیا کے عام تصورات (۱) چینی تصور

بہرحال ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ قرآن کے ظہور کے وقت صفاتِ الٰہی کے عام تصورات کی نوعیت کیا تھی اور قرآن کے جو تصور پیش کیا۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟

ظہور قرآن کے وقت پانچ دینی تصورِ فکرِ انسانی پر چھائے ہوئے تھے۔
چینی[1]، ہندوستانی[2]، مجوسی[3]، یہودی[4]، اور مسیحی[5]

دنیا کی تمام قدیم قوموں میں چینیوں کی یہ خصوصیت تسلیم کرنی پڑتی ہے، کہ ان کے تصورِ الوہیت نے ابتداء ہیں جو ایک سادہ اور مبہم نوعیت اختیار کر لی تھی۔ وہ بہت حد تک برابر قائم رہی اور زمانۂ مابعد کی ذہنی وسعت پذیریاں اس میں زیادہ مداخلت نہ کر سکیں، تاہم تصور کا کوئی مرقع بغیر رنگ وروغن کے بن نہیں سکتا۔ اس لئے آہستہ آہستہ اس سادہ خاکے میں بھی مختلف نمایاں ہونے لگیں۔ اور بالآخر ایک رنگین تصویر متشکل ہو گئی۔

چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک "آسمانی" ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ اور ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کی علویت کے تصور کے لئے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اٹھا سکتے آسمان حسن وبخشائش کا بھی مظہر ہے۔ قہر وغضب کی ہولناکی ہے۔ اس کا سورج روشنی اور حرارت بخشتا ہے۔ اس کے ستارے اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں۔ اس کی بارش زمین کو طرح طرح کی روئیدگیوں سے معمور کر دیتی ہے۔ لیکن اس کی بجلیاں ہلاکت کا بھی پیام ہیں۔ اور اس کی گرج دلوں کو دہلا بھی دیتی ہے۔ اس لئے آسمانی خدا کے تصور میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں ایک طرف اس کی جود وبخشائش ہے۔ دوسری طرف اس کا قہر وغضب ہے۔ چینی شاعری کی قدیم کتاب میں ہم قدیم ترین چینی تصورات کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں جا بجا ہمیں ایسے مخاطبات ملتے ہیں۔ جن میں آسمانی اعمال کی ان متضاد نمودوں پر حیرانی وسرگشتگی کا اظہار کیا گیا ہے" یہ بات کیا ہے کہ تیرے کاموں میں یکسانی اور ہم آہنگی نہیں تو زندگی بھی بخشتا ہے اور تیرے پاس ہلاکت کی بجلیاں بھی ہیں۔

یہ "آسمان" چینی تصور کا ایک ایسا بنیادی عنصر بن گیا کہ چینی جمیعت آسمانی جمیعت اور چینی مملکت آسمانی مملکت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ رومی جب پہلے پہل چین سے آشنا ہوئے تو انہیں ایک "آسمانی مملکت" ہی کی خبر ملی تھی۔ اس وقت سے (COELUM) کے مشتقات کا چین کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یعنی "آسمان والے" اور "آسمانی" اب بھی انگریزی میں چین کے باشندوں کے لئے مجازاً "سلسٹیل" (CELESTIAL) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی آسمانی ملک کے باشندے۔

اس آسمانی ہستی کے علاوہ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی تھیں۔ جنہیں دوسرے عالم میں پہنچ کر تدبیر وتصرف کی طاقتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ اور اس لئے پرستش کی مستحق سمجھی گئی تھیں۔ ہر خاندان اپنی معبود روحیں رکھتا ہے۔ اور ہر علاقہ اپنا مقامی خدا؟

لاؤ، ٹزو اور کنگ فوزی کی تعلیم

سنہ مسیحی سے پانچ سو برس پہلے لاؤ، تزو (LAO-TZU) اور کنگ فوزی[1] (KUNG-FU-TSE) کا ظہور ہوا۔

کنگ فوزی نے ملک کو عملی زندگی کی سعادتوں کی راہ دکھائی اور معاشرتی حقوق و فرائض کی ادائیگی

[1] کنگ فوزی فارسی تلفظ ہے۔ صحیح چینی تلفظ "کونگ - فو - تسی" ہے۔ ایرانیوں نے اسے زیادہ صحت کے ساتھ نقل کیا۔ یعنی صرف اتنی تبدیلی کی کہ "فوتسی" کو "فوزی" کر دیا۔ لیکن یورپ کی زبانوں نے اسے یک قلم مسخ کر کے "کنفوشیس" (CONFUCIUS) بنا دیا۔ اور اس کی آواز اصل آواز سے اس درجہ مختلف ہو گئی کہ ایک چینی سن کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے۔ اور کس ملک کی بولی میں؟

کا ایک قانون مہیا کر دیا۔ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے "روحِ آسمان" کا قدیمی تصور بدستور قائم رہا، اور اجداد پرستی کے عقائد نے اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی نوعیت پیدا کر لی۔ گویا آسمانی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ گزری ہوئی روحوں کا وسیلہ اور تشفع ہے، روحانی تصورات میں وسیلہ کا اعتقاد ہمیشہ عابدانہ پرستش کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہ توسل بھی عملاً تعبد تھا۔ اور ہر طرح کے دینی اعمال و رسوم کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔

ہندوستان اور یونان میں دیوتاؤں کے تصور نے نشوونما پائی تھی جو خدائی کی ایک بالاتر ہستی کے ساتھ کارخانۂ عالم کے تصرفات میں شرکت رکھتے تھے۔ چینی تصور میں یہ خانہ بزرگوں کی روحوں نے بھرا اور اس طرح اشراک اور تعدد کے تصور کی پوری نقش آرائی ہو گئی۔

کنگ فوزی کے ظہور سے پہلے قربانیوں کی رسم عام طور پر رائج تھی۔ کنگ فوزی نے اگرچہ ان پر زور نہیں دیا۔ لیکن ان سے تعرض بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہ چینی مندروں کا تقاضا برابر پوری کرتی رہیں۔ قربانیوں کے عمل کے پیچھے طلب بخشش اور جلب تحفظ دونوں کے تصور کام کرتے تھے۔ قربانیوں کے ذریعہ ہم اپنے مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا کے قہر و غضب سے محفوظ بھی ہو جا سکتے ہیں۔ پہلی غرض کے لئے وہ نذر ہیں، دوسری غرض کے لئے فدیہ!

لاؤ۔ تزنے "تاؤ" یعنی طریقت کے مسلک کی بنیاد ڈالی۔ اسے چین کا تصوف اور ویدانت سمجھنا چاہیئے تاؤ نے چینی زندگی کو روحانی استغراق اور داخلی مراقبہ کی راہوں سے آشنا کیا، اور مذہبی اور اخلاقی تصوّرات میں ایک طرف گہرائی اور دقت آفرینی پیدا ہوئی، دوسری طرف لطافت فکر اور رقت خیال کے نئے نئے دروازے کھلے۔ لیکن تصوّف ملک کا عام دینی تصور نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی محدود جگہ چین میں بھی وہی رہی جو ویدانت کی ہندوؤں میں اور تصوف کی مسلمانوں میں رہی ہے۔

چین کا شمنی تصوّر

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے شمنی[1] مذہب (یعنی بدھ مذہب) کی چین میں اشاعت ہوئی۔ یہ مہایانا بدھ مذہب تھا۔ جو مذہب

[1] سنسکرت میں "شمن" زاہد اور تارک الدنیا کو کہتے ہیں۔ بدھ مذہب کے تارک الدنیا بھکشو اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ پیروانِ بدھ کو "شمنی" کہنے لگے۔ اسی "شمنی" کو عربوں نے "سُمنی" بنا لیا اور وسط ایشیا کے باشندوں نے "شامانی"۔ چنانچہ زکریا رازی، البیرونی اور ابن الندیم وغیرہم نے بدھ مذہب کا ذکر سمنیہ ہی کے نام سے کیا ہے۔ البیرونی بدھ مذہب کی عالمگیر اشاعت کی تاریخ کی بھی خبر رکھتا تھا۔ چنانچہ کتاب الہند کی پہلی فصل میں اس طرف اشارات کئے ہیں۔ چنگیز خاں کی نسبت یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ شامانی مذہب کا پیرو تھا۔ یعنی بدھ مذہب کا چونکہ شامانی اور بدھ مذہب کا ترادف واضح نہیں ہوا تھا اس لئے انیسویں صدی کے بعض یورپی مورخوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئیں اور وہ اس کا صحیح مفہوم متعین نہ کر سکی۔ یہ غلط فہمی یورپ کے عام اہل قلم میں آج بھی موجود ہے۔ شمالی سائبیریا اور چینی ترکستان کے ہم سایہ علاقوں کے تورانی قبائل اپنے مذہبی پیشواؤں کو جو تبت کے لاماؤں کی طرح ملکی پیشوائی بھی رکھتے ہیں، "شامان" کہتے ہیں۔ سویٹ روس کی حکومت آج کل ان کی تعلیم و ترتیب کا سر و سامان کر رہی ہے۔ یہ لوگ بھی بلاشبہ بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ لیکن ان کا بدھ مذہب منگولیوں کے محرّف مذہب کی بھی ایک مسخ شدہ صورت ہے اس لئے اصلیت کی بہت کم جھلک باقی رہ گئی ہے اور اسی لئے ان کی مذہبی اصلیت کے بدلے میں آج کل ان کی معنت حیرانی ظاہر کر رہے ہیں۔ انگریزی میں انہی تورانی قبائل کے مذہب کی نسبت شمنزم (SHAMANISM) کی ترکیب رائج ہو گئی ہے۔ اور جادوگری کے اعمال و اشغال کو (SHAMANISTIC) اور (SHAMANIE) وغیرہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ یہ شمنی بعینہٖ وہی شامانی اور "شمنی" ہے کی ایک محرف صورت ہے چونکہ ان قبائل میں جادوگری کا اعتقاد عام ہے اور وہ اپنے شامانوں سے بیماریوں میں جادو کے ٹونے ٹوٹکے کراتے ہیں اس لئے جادوگری کے لئے یہ لفظ مستعمل ہو گیا ہے۔

کے اصلی مبادیات سے بہت دور ہو چکا تھا۔ اور جس نے تبدل پذیری کی ایسی بے روک لچک پیدا کر لی تھی کہ جس شکل و قطع کا خانہ ملتا تھا۔ ویسا ہی جسم بنا کر اس میں سما جاتا تھا۔ یہ جب چین، کوریا اور جاپان میں پہنچا۔ تو اسے ہندوستان اور سیلون سے مختلف قسم کی فضا ملی۔ اور اس نے فوراً مقامی وضع و قطع اختیار کر لی۔

بدھ مذہب کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کے تصور سے خالی ہے۔ لیکن پیروان بدھ نے خود بدھ کو خدا کی جگہ دے دی اور اس کی پرستش کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کر دیا۔ جس کی کوئی دوسری نظیر اصنامی مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ چین، کوریا اور جاپان کی عبادت گاہیں بھی اب اس نئے معبود کے بتوں سے معمور ہو گئیں۔

(۲) ہندوستانی تصور

ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ ایک طرف اس کا توحیدی فلسفہ ہے۔ دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ توحیدی فلسفہ نے استغراقِ فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کئے اور معاملہ کو فکری بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا۔ جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصورات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اشراک اور تعددِ الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصوروں کو اتنی دور تک پھیلنے دیا۔ کہ ہر پتھر معبود ہو گیا۔ ہر درخت خدائی کرنے لگا۔ اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی۔ وہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اڑا۔ اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اس کے خواص نے اپنے لئے توحید کی جگہ پسند کی۔ اور عوام کے لئے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی!

اوپانی شد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصور

رگ وید کے زمزموں میں ہمیں ایک طرف مظاہر قدرت کی پرستش کا ابتدائی تصور بتدریج پھیلتا اور متجسم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بالاتر اور خالق کل ہستی کا توحیدی تصور بھی آہستہ آہستہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً دسویں حصے کے زمزموں میں تو اس کی نمود صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ توحیدی تصور کسی بہت پرانے گزشتہ عہد کے بنیادی تصور کا بقیہ تھا یا مظاہر قدرت کی کثرت آرائیوں کا تصور اب خود بخود کثرت سے وحدت کی طرف ارتقائی قدم اٹھانے لگا تھا۔ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن بہرحال ایک ایسے قدیم عہد میں بھی جب کہ رگ وید کے تصوروں نے نظم و سخن کا جامہ پہننا شروع کیا تھا۔ توحیدی تصور کی جھلک صاف صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ خدا کا وہ ہجوم جس کی تعداد تین سو تینتیس یا اسی طرح کی ثلاثی کثرت تک پہنچ گئی تھی[1]۔ بالآخر تین دائروں میں سمٹنے لگا۔ یعنی زمین، فضا اور آسمان میں، اور پھر اس نے ایک ربّ الارباب[2]ی تصور (HENOTHEISM) کی نوعیت پیدا کر لی۔ پھر یہ رب الاربابی تصور اور زیادہ سمٹنے لگتا ہے۔ اور ایک سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی ہستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہ ہستی کبھی "ورون" میں نظر آتی ہے کبھی "اندر" میں اور کبھی "اگنی" میں لیکن بالآخر ایک خالق ہستی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جو "پرجاپتی" (پروردگار عالم) اور "وشوا کرمن" (خالق کل) کے نام سے پکاری جانے لگتی ہے، اور جو تمام کائنات کی اصل و

---

[1] رگ وید۔ حصہ سوم ۹-۹

[2] رب الاربابی تصور سے مقصود تصور کی وہ نوعیت ہے۔ جب خیال کیا جاتا ہے کہ بہت سے خداؤں میں ایک خدا سب سے بڑا ہے اور چھوٹے خداؤں کو اس کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ یونانیوں اور رومیوں کا عقیدہ مشتری کی نسبت تھا۔

حقیقت ہے"۔ وہ ایک ہے مگر علم والے اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ اگنی، یم، ماتری شوان (۴۶۔۱۶۴)" وہ ایک نہ تو آسمان ہے نہ زمین ہے۔ نہ سورج کی روشنی ہے نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ، ہمیشگی، لازوالی، وہ کیا ہے؟ وہ شاید رٹ ہے جو ہر کے روپ میں ابھرتی ہے روحانیت کے بھیس میں۔ وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی۔ (دھم ۱۲۱۔۲)" ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہم اسے پوری طرح بتلا نہیں سکتے۔ (ایضاً ۱۲۱) وہ ایکم ست" ہے۔ یعنی حقیقت یگانہ، الحق، یہی وحدت ہے، جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جا سکتی ہے۔[1]

یہی مبادیات ہیں جنہوں نے اوپانی شدوں میں توحید وجودی (PANTHEISM) کے تصور کی نوعیت پیدا کر لی۔ اور پھر ویدانت کے مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS) نے انہی بنیادوں پر استغراقِ فکر و نظر کی بڑی بڑی عمارتیں تیار کر دیں۔

وحدۃ الوجودی اعتقادات مطلق کے کشفی مشاہدات پر مبنی تھا۔ نظری عقائد کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لئے اصلاً یہاں صفات آرائیوں کی گنجائش نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو صرف سلبی صفات (NEGATIVE ATTRIBUTES) ہی ابھر سکتی تھیں۔ ایجابی (POSITIVE) صفات کی صورت آرائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یعنی یہ تو کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ کیوں کہ ایجابی صفات کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا۔ وہ ہمارے ذہن و فکر ہی کا بنایا ہوا نقشہ ہوگا۔ اور ہمارا ذہن و فکر امکان و اضافت کی چار دیواری میں اس طرح مقید ہے کہ مطلق اور غیر محدود حقیقت کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ جب تصور کرے گا۔ تو ناگزیر ہے کہ مطلق کو مشخص بنا کر سامنے لائے اور جب تشخص آیا تو اطلاق باقی نہیں رہا بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر معاملہ کی پوری تصویر کھینچ دی تھی۔

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند!

یہی وجہ ہے کہ اوپانی شد نے پہلے ذاتِ مطلق (برہمان) کو ذاتِ مشخص (ایشور) کے مرتبہ میں اتارا،[2] اور جب اطلاق نے تشخص کا نقاب چہرہ پر ڈال لیا، تو پھر اس نقاب پوش چہرہ کی صفتوں کی نقش آرائیاں کی گئیں اور اس طرح وحدۃ الوجودی عقیدہ نے ذاتِ مشخص و متصف (ساگون) کے تصور کا مقام بھی مہیا کر دیا۔

---

[1] رگ وید اور اوپانی شد کے مطالب کے لئے ہم نے حسب ذیل مصادر سے مدد لی ہے۔

MAX MULLER	دی ویدک ہیمز	BLOOMFIELD	دی ریلیجن آف دی وید
KAEIGI	دی رگ وید	GHATE	لیکچرز آن دی رگ وید
DEUSSEN	دی فلاسفی آف اوپانی شد	HUME	دی تھرٹین پرنسپل اوپانی شد

[2] ہمارے صوفیائے کرام نے اسی صورت حال کو یوں تعبیر کیا ہے کہ "احدیت" نے مرتبہ "واحدیت" کی تجلی میں تنزل کیا۔ "احدیت" یعنی یگانہ ہونا "واحدیت" یعنی اول ہونا۔ یگانہ ہستی کو ہم اول نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ جبھی ہوگا۔ جب دوسرا، تیسرا، اور چوتھا بھی ہو، اور یگانگی بحت کے مرتبہ میں دوسرے اور تیسرے کی گنجائش ہی نہیں لیکن جب "احدیت" نے "واحدیت" کے مرتبہ میں تنزل کیا۔ تو اسے "ہو الاول" کا مرتبہ ظہور میں آ گیا۔ اور جب اول ہوا تو دوسرے، تیسرے اور چوتھے کے تعینات بھی ظہور میں آنے لگے۔ و ما احسن قول الشاعر العارف:

دریا بہ کہن چو بر زند موجۂ نو
موجش خوانند و فی الحقیقت دریاست

جب ان صفات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بلاشبہ ایک نہایت بلند تصور سامنے آجاتا ہے۔ جس میں سلبی اور ایجابی، دونوں طرح کی صفتیں اپنی پوری نمو داریاں رکھتی ہیں۔ اس کی ذات یگانہ ہے۔ اس ایک کے لئے دوسرا نہیں۔ وہ بے ہمتا ہے۔ بے مثال ہے۔ ظرف وزمان اور مکان کے قیود سے بالاتر ازل وابدی۔ ناممکن الادراک، واجب الوجود، وہی پیدا کرنے والا ہے۔ وہی حفاظت کرنے والا اور وہی فنا کر دینے والا۔ وہ علۃ العلل اور علّتِ مطلقہ (اپادنا اور نیمتا کارنا) ہے۔ تمام موجودات اسی سے بنیں، اسی سے قائم رہتی ہیں۔ اور پھر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ وہ نور ہے، کمال ہے۔ حسن ہے۔ سرتا سر پاکی ہے۔ سب سے زیادہ طاقت ور، سب سے زیادہ رحم ومحبت والا۔ ساری عبادتوں اور عاشقیوں کا مقصودِ حقیقی!

لیکن ساتھ ہی دوسری طرف یہ حقیقت بھی ہمیں صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ کہ توحیدی تصور کی یہ بلندی بھی اشراک اور تعدد کی آمیزش سے خالی نہیں رہی۔ اور توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات کا بے مثل عقیدہ جلوہ گر نہ ہو سکا۔ زمانۂ حال کے ایک قابل ہندو مصنف کے لفظوں میں دراصل اشراکی اور تعددی تصور (POLYTHEISTIC) ہندوستانی دل ودماغ میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ کہ اب اسے یک قلم اکھاڑ کر پھینک دینا آسان نہ تھا۔ اس لئے ایک یگانہ ہستی کی جلوہ طرازی کے بعد بھی دوسرے خدا نابود نہیں ہو گئے۔ البتہ اس یگانہ ہستی کا قبضہ واقتدار ان سب پر چھا گیا۔ اور سب اس کی ماتحتی میں آگئے[۱]

اب اس طرح کی تصریحات ہمیں ملنے لگتی ہیں کہ بغیر اس بالاتر ہستی (برہمان) کے "اگنی" بھی کچھ نہیں کر سکتی "یہ اسی کا (برہمان کا) خوف ہے۔ جو تمام دیوتاؤں سے ان کے فرائض منصبی انجام دلاتا ہے۔" (تیتترا اوپانی شد) راجہ اشواپتی نے جب پانچ گھر والوں سے پوچھا "تم اپنے دھیان میں کس کی پرستش کرتے ہو؟" تو ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک دیوتا کا نام لیا۔ اس پر اشواپتی نے کہا "تم نے ہر ایک نے حقیقت کے صرف ایک ہی حصہ کی پرستش کی، حالانکہ وہ سب کے ملنے سے شکل پذیر ہوتی ہے" اندر اس کا سر ہے "سوریہ" (سورج) اس کی آنکھیں ہیں "وایو" سانس ہے "آکاش" (ایتھر) جسم ہے "دھرتی" (زمین) اس کا پاؤں ہے" ایضاً)[۲]

لیکن پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب حقیقت کی قیومیت اور احاطہ پر زور دیا جاتا ہے تو تمام موجودات کے ساتھ دیوتاؤں کی ہستی بھی غائب ہو جاتی ہے، کیونکہ تمام موجودات اسی پر موقوف ہیں۔ وہ کسی پر موقوف نہیں "جس طرح رتھ کے پہیے کی تمام شاخیں ایک ہی دائرہ کے اندر اپنا وجود رکھتی ہیں، اسی طرح تمام چیزیں تمام دیوتا، تمام دنیائیں، اور تمام آلات اسی ایک وجود کے اندر ہیں" (برہادرنیاک اوپانی شد باب ۲-۵) یہاں وہ درخت موجود ہے جس کی جڑ اوپر کی طرف چلی گئی ہے۔ اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ برہمان ہے لافانی۔ تمام کائنات اسی میں ہے۔ کوئی اس سے باہر نہیں (تیتترا ۱-۱۰)

---

[۱] پروفیسر رادھا کرشنان۔ انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ ۱۴۴۔ طبع ثانی

[۲] اگر اوپانی شد کی اشراکی جگہ کے دوسرے صریح شواہد موجود نہ ہوتے تو اس طرح کی تصریحات بہ آسانی مجازات پر محمول کی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ داراشکوہ نے انہیں استعارات ہی پر محمول کیا ہے۔

یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اوپانی شد ایک سو آٹھ ہیں اور مختلف عہدوں کی مرتبہ ہوئے ہیں ہر اوپانی شد اپنے عہد کے تدریجی تصورات ومباحث کے اثرات پیش کرتا ہے، اور یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ان نتائج پر مبنی ہے جو مجموعی حیثیت سے نکالے گئے ہیں۔

یہاں ہم مصنف موصوف کے الفاظ پھر مستعار لیتے ہیں "یہ درا صل ایک سمجھوتا تھا۔ جو چند خاص دماغوں کے فلسفیانہ تصور نے انسانی بھیڑ کے وہم پرستانہ ولولوں کے ساتھ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواص اور عوام کی فکری موافقت کی ایک آب وہوا پیدا ہو گئی، اور وہ برابر قائم رہی"۔ؔ

آگے چل کر ویدانت کے فلسفہ نے بڑی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں، لیکن خواص کے توحیدی تصوّر میں عوام کے اشراکی تصور سے مفاہمت کا جو میلان پیدا ہو گیا تھا، وہ متزلزل نہ ہو سکا۔ بلکہ اور زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا گیا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ سالک جب عرفان حقیقت کی منزلیں طے کر لیتا ہے تو پھر ماسویٰ کی تمام ہستیاں معدوم ہو جاتی ہیں، اور ماسویٰ میں دیوتاؤں کی ہستیاں بھی داخل ہیں۔ گویا دیوتاؤں کی ہستیاں مظاہر وجود کی ابتدائی تعینات ہوئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بنیاد بھی برابر قائم رکھی گئی کہ جب تک اس آخری مقام عرفان تک رسائی حاصل نہ ہو جائے۔ دیوتاؤں کی پرستش کے بغیر چارہ نہیں اور اُن کی پرستش کا نظام قائم ہو گیا ہے، اسے چھیڑنا نہیں چاہئے۔ اس طرح گویا ایک طرح کے توحیدی۔ اشراکی تصور (POLYTHEISM (MONATHEISTH) کا مخلوط مزاج پیدا ہو گیا جو بیک وقت فکر ونظر کا توحیدی تقاضا بھی پورا کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اصنامی عقائد کا نظام عمل بھی سنبھالے رکھنا چاہتا تھا۔ ویدانت کے بعض مذہبوں میں تو یہ مخلوط نوعیت بنیادی تصوروں تک سرایت کر گئی۔ مثلاً نیمبارک اور اُس کا شاگرد دسری نواس برہم سوتر کی شرح کرتے ہوئے ہمیں بتلاتے ہیں کہ "اگرچہ برہما یا کرشن کی طرح کوئی نہیں۔ مگر اس سے ظہور میں آئی ہوئی دوسری قوتیں بھی جو اُس کے ساتھ اپنی نمود رکھتی ہیں۔ اور اُسی کی طرح کار فرمائی میں شریک ہیں۔ چنانچہ کرشن کے بائیں طرف رادھا ہے۔ یہ بخشش ونوال کی ہستی ہے۔ تمام نتائج وثمرات بخشنے والی۔ ہمیں چاہیئے کہ برہما کے ساتھ رادھا کی بھی پرستش کریں"۔ؔ

اسی موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ فطرتِ کائنات کے جن قوائے مدبرہ کو سامی تصور نے "ملائک" اور "ملائکہ" سے تعبیر کیا تھا۔ اس کو آریائی تصور نے "دیو" اور "دیوتا" سے تعبیر کیا۔ یونانیوں کا "تھیوس" (BEOS) لاطینیوں کا ڈےیوس (DEUS) پارسیوں کا "یزتا" (یزدان) سب کے اندر وہی ایک بنیادی مادہ اور وہی ایک بنیادی تصور کام کرتا رہا۔ سنسکرت میں "دیو" ایک لچکدار لفظ ہے جو متعدد معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن جب مافوق الفطرت ہستیوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ایک ایسی غیر مادی اور روحانی ہستی کے ہو جاتے ہیں جو اپنے وجود میں روشن اور درخشاں ہو۔ سامی ادیان نے ان روحانی ہستیوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں دیکھی کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کارکن ہستیاں ہیں۔ لیکن آریائی تصور نے ان میں تدبیر وتصرف کی بالاستقلال طاقتیں دیکھیں، اور جب توحیدی تصوّر کے قیام سے وہ استقلال باقی نہیں رہا تو توسل اور تزلف کا درمیانی مقام انہوں نے پیدا کر لیا۔ یعنی اگرچہ وہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے ان کی پرستش ضروری ہوئی۔ ایک پرستار کی پرستش اگرچہ ہو گی معبودِ حقیقی کے لئے مگر ہو گی اُنہی کے آستانوں پر۔ ہم براہ راست خدا کے آستانے تک پہنچ نہیں سکتے ہمیں پہلے دیوتاؤں کے آستانوں کا وسیلہ پکڑنا چاہیئے۔ در اصل یہی توسل وتزلف کا عقیدہ ہے جس نے ہر جگہ توحیدی اعتقاد وعمل کی تکمیل میں خلل ڈالا۔ ...نہ ایک

لہ ویدانت پاری جات سواربھ جلد سوم صفحہ ۲۵۔ اس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ، ڈاکٹر رومابوس مدال ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے حال میں شائع کیا ہے۔

خدا کی یگانگی اور بالاتری سے تو کسی کو بھی انکار نہ تھا۔ عرب جاہلیتہ کے بُت پرستوں کا بھی یہی عقیدہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی

بہر حال شرک فی الصفات اور شرک فی العبادات کا یہی وہ عنصری مادّہ تھا۔ جس نے ہندوستان کے عملی مذہب کو سرتاسر اشراک اور اصنام پرستی کے عقائد سے معمور کر دیا، اور بالآخر یہ صورتِ حال اس درجہ گہری اور عام ہوگئی کہ جب تک ایک سُراغ رساں جستجو اور تفحّص کی دور دراز مسافتیں طے نہ کرلے، ہندو عقیدہ کے توحیدی تصور کا کوئی نشان نہیں پا سکتا۔ توحیدی تصوّر نے یہاں ایک ایسے راز کی نوعیت پیدا کرلی جس تک صرف خاص خاص عارفوں ہی کی رسائی ہو سکتی ہے ہم اس کا سراغ پہاڑوں کے غاروں میں پا سکتے ہیں۔ لیکن کوچہ و بازار میں نہیں پا سکتے۔ گیارہویں صدی مسیحی میں جب ابو ریحان بیرونی ہندوستان کے علوم و عقائد کے سراغ میں نکلا تھا تو یہ متضاد صورتِ حال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سولہویں صدی میں ویسی ہی حیرانی ابوالفضل کو پیش آئی، اور پھر اٹھارہویں صدی میں سر ولیم جونس کو۔

بہترین معذرت جو اس صورت حال کی کی جا سکتی ہے، وہ وہی ہے جس کا اشارہ گیتا کے شہرۂ آفاق نزانوں میں ہمیں ملتا ہے۔ اور جس نے البیرونی کے فلسفیانہ دماغ کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا یعنی یہاں پہلے دن سے عقائد و عمل کی مختلف راہیں مصلحۃً کھلی رکھی گئیں تاکہ خواص اور عوام دونوں کی فہم و استعداد کی رعایت ملحوظ رہے۔ توحیدی تصوّر خواص کے لئے تھا۔ کیونکہ وہی اس بلند مقام کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اصنامی تصوّر عوام کے لئے تھا۔ کیونکہ اُن کی طفلانہ عقول کے لئے یہی راہ موزوں تھی۔ اور پھر چونکہ خواص بھی جمعیت و معاشرت کے عام ضبط و نظم سے باہر نہیں رہ سکتے، اس لئے عملی زندگی میں انہیں بھی اصنام پرستی کے تقاضے پورے کرنے ہی پڑتے تھے۔ اور اس طرح ہندو زندگی کی بیرونی وضع و قطع بلا استثنا اشراک اور اصنام پرستی ہی کی رہتی آئی۔

البیرونی حکمائے یونان کے اقوال نقل کرکے دکھایا ہے کہ اس بارے میں ہندوستان اور یونان دونوں کا حال ایک ہی طرح کا رہا۔ پھر گیتا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "بہت سے لوگ مجھ تک (یعنی خدا تک) اس طرح پہنچنا چاہتے ہیں کہ میرے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں، لیکن میں اُنکی مرادیں بھی پوری کر دیتا ہوں۔ کیونکہ میں اُن سے اور اُن کی عبادت سے بے نیاز ہوں"[۱]

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقعے پر زمانۂ حال کے ایک ہندو مصنف کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ گوتم بُدھ کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب کے تصوّر الوہیت نے جو عام شکل و صورت پیدا کرلی تھی۔ اس پر بحث کرتے ہوئے یہ قابل مصنف لکھتا ہے:

---

[۱] البیرونی نے کتاب الہند میں بعض سنسکرت کتابوں سے بتوں کے بنانے کے احکام و قواعد نقل کئے ہیں اس کے بعد لکھتا ہے وکان الغرض فی حکایۃ ھذہ الھذیان ان تعرف الصورۃ من صنمھا اذا شوھد و لیتحقق ما قلنا من ان ھذہ الاصنام للعوام الذین سفلت مراتبھم وقصرت معارفھم فما عمل صنم قط باسم علوی المادۃ فضلاً عن اللہ تعالیٰ، ولیعرف کیف یعبد السفل بالتمویہات، ولذلک قیل فی کتاب گیتا ان کثیراً من الناس یتقربون فی مباغیھم الیّ بغیری و یتوسلون بالصدقات والتسبیح والصلاۃ لسوای فاقویھم علیھا و اوفقھم لھا و اوصلھم الی ارادتھم، لاستغنائی عنھم (صفحہ ۵۹) آج کل کے تمام ہندو اہل نظر جو ہندو عقائد و تصورات کی فلسفیانہ تعبیر کرنی چاہتے ہیں، عموماً یہی توجیہہ پیش کرتے ہیں جو البیرونی نے پیش کی تھی۔ ابوالفضل اور دارا شکوہ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

"گوتم بدھ کے عہد میں جو مذہب ملک پر چھایا ہوا تھا، اس کے نمایاں خط و خال یہ تھے کہ لین دین کا ایک سودا تھا۔ جو خدا اور انسانوں کے درمیان ٹھہر گیا تھا۔ جبکہ ایک طرف اوپانی شد کا برہمن تھا جو ذاتِ الوہیت کا ایک اعلیٰ اور شائستہ تصور پیش کرتا تھا، تو دوسری طرف ان گنت خداؤں کا ہجوم تھا جن کے لئے کوئی حد بندی نہیں ٹھہرائی جاسکتی تھی۔ آسمان کے ستارے، مادے کے عناصر، زمین کے درخت، جنگل کے حیوان، پہاڑوں کی چٹانیں، دریاؤں کی جدولیں، غرضیکہ موجوداتِ خلقت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو خدائی حکومت میں شریک نہ کر لی گئی ہو۔ گویا ایک بے لگام اور خود رو تخیل کو پروانہ مل گیا تھا کہ دنیا کی جتنی چیزوں کو خدائی مسند پر بٹھا سکتا ہے، بے روک ٹوک بٹھاتا رہے۔ پھر جیسے خداؤں کی یہ بے شمار بھیڑیں بھی اس کے ذوقِ خدا سازی کے لئے کافی نہ ہوئی ہوں۔ طرح طرح کے عفریتوں اور عجیب الخلقت جسموں کی متخیلہ صورتوں کا بھی اُن پر اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اوپانی شدوں نے فکر و نظر کی دنیا میں اِن خداؤں کی سلطانی برہم کر دی۔ لیکن عمل کی زندگی میں انہیں نہیں چھیڑا گیا۔ وہ بدستور اپنی خدائی مسندوں پر جمے رہے۔"[1]

شمنی مذہب اور اُس کے تصورات

قدیم برہمنی مذہب کے بعد شمنی مذہب (یعنی بدھ مذہب) کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ہندوستان کا عام مذہب یہی تھا۔ شمنی مذہب کی اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئیں ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقوں کے ایک گروہ نے اسے اوپانی شدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا تھا اور خیال کیا تھا کہ "نروان" میں جذب و انفعال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے۔ یعنی جس سرچشمہ سے انسانی ہستی نکلی ہے۔ پھر اسی میں واصل ہو جانا "نروان" یعنی نجات کامل ہے۔ لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ شمنی مذہب خدا اور رُوح کی ہستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اس کا دائرۂ اعتقاد و عمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلہ میں محدود ہے۔ وہ صرف پرکرتی یعنی مادۂ ازلی کا حوالہ دیتا ہے۔ جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ "نروان" سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے چکّر سے نجات مل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک مابعد زمانے کے شمنی مفکّروں کی تصریحات کا تعلق ہے۔ یہی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کا ایک گروہ لاادریت (AGNOSTICISM) تک پہنچ کر رُک گیا ہے، تو دوسرا گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور مدّعیانہ انکار کی راہ اختیار کی ہے۔ موکشا آکر گپتا نے "ترک بھاشا"[2] میں ان تمام دلائل کا رد کیا ہے۔ جو نیائے[3] اور ویشیشک طریق نظر کے نظّار خدا کی ہستی کے اثبات میں پیش کرتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ خود گوتم بدھ کا سکوت و توقف بھی انکار ہی پر مبنی تھا۔ اس کے سکوتی تحفظات متعدد

---

[1] پروفیسر ایس۔ رادھا کرشنان۔ انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ ۴۵۳۔ طبع ثانی۔

[2] یہ قدیم کتاب جس کا صرف تبتی نسخہ دنیا کے علم میں آیا تھا، اب اصل سنسکرت میں نکل آئی ہے اور گائیکواڑ اورنٹیل سیریز کے ادارے نے حال میں شائع کر دی ہے۔ میسور کی مشرقی کتب خانہ بھی اس کا ایک دوسرا نسخہ اشاعت کے لئے مرتب کر رہا ہے۔

[3] "نیائے" یعنی منطق، "ویشیشک" طریق نظر منطقی نقد و تحلیل کا ایک خاص مسلک ہے۔

مسئلوں میں ثابت ہیں، اور اس کے متعدد محمل قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر ان تمام اقوال پر جو براہِ راست اُس کی طرف منسوب ہیں۔ غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا مسلک نفیِ ذات کا نہ تھا۔ نفیِ صفات کا تھا۔ اور نفیِ صفات کا مقام ایسا ہے کہ انسانی فکر و زبان کی تمام تعبیرات معطّل ہو جاتی ہیں۔ اور سکوت کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

علاوہ بریں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ اس کے ظہور کے وقت اصنامی خدا پرستی کے مفاسد بہت گہرے ہو چکے تھے، اور اصنامی خدا پرستی بجائے خود راہِ حقیقت کی سب سے بڑی روک بن گئی تھی۔ اس نے اس روک سے راستہ صاف کر دینا چاہا۔ اور تمام توجہ زندگی کی عملی سعادت کے مسئلہ پر مرکوز کر دی۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ برہمنی خدا پرستی کے عقائد سے انکار کیا جائے کہ نجات کی راہ ان معبودوں کی پرستش میں نہیں ہے۔ بلکہ علمِ حق اور عملِ حق میں ہے۔ یعنی "اشٹانگ مارگ[1]" میں ہے۔ آگے چل کر اس اضافی انکار نے مطلق انکار کی شکل پیدا کر لی، اور پھر برہمنی مذہب کی مخالفت کے غلو نے معاملہ کو دور تک پہنچا دیا[2]۔

بہر حال خود گوتم بدھ اور اس کی تعلیم کے شارحوں کی تصریحات اس بارے میں کچھ ہی رہی ہوں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس کے پیروؤں نے خدا کے تصوّر کی خالی مسند بہت جلد بھر دی۔ انہوں نے اس مسند کو خالی دیکھا، تو خود گوتم بدھ کو وہاں لا کر بٹھا دیا، اور پھر اس نئے معبود کی پرستش اس جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دی کہ آدھی سے زیادہ دُنیا اُس کے بُتوں سے معمور ہو گئی۔

آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را
وقت است کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

گوتم بُدھ کی وفات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ پیروانِ بدھ کی اکثریت نے اُس کی شخصیت کو عام انسانی سطح سے بالاتر دیکھنا شروع کر دیا تھا، اور اُس کے آثار و تبرکات کی پرستش کا میلان بڑھنے لگا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب مذہب کی پہلی مجلسِ اعظم راج گیری میں منعقد ہوئی اور اُس کے شاگردِ خاص آنند نے اُس کی آخری دعایا بیان کیں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اُس کی روایت پر مطمئن نہ ہوئے اور اس کے مخالف ہو گئے۔ کیونکہ اس کی روایتوں انہیں ما ورائے انسانیت عظمت نظر نہیں آئی۔ جسے اب اُن کی طبیعت ڈھونڈھنے لگی تھی۔ تقریباً سو برس بعد جب دوسری مجلس ویسالی (مظفر پور بہار) میں منعقد ہوئی، تو اب مذہب کی بنیادی سادگی اپنی جگہ کھو چکی تھی

---

[1] گوتم بدھ کی تعلیم میں "اشٹانگ مارگ" یعنی آٹھ باتوں کا طریقہ ایک بنیادی اصل ہے۔ آٹھ باتوں سے مقصود علم اور عمل کا تزکیہ و طہارت ہے۔ علمِ حق، رحم و شفقت، قربانی، ہوا و ہوس سے آزادی، خودی کو مٹانا وغیرہ۔

[2] میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی استنباط ہے، اور مجھے حق نہیں کہ اپنی رائے کو وثوق کے ساتھ اُن محققوں کے مقابلہ میں پیش کروں جنہوں نے اس موضوع کے مطالعہ میں زندگیاں بسر کر دی ہیں۔ تاہم میں مجبور ہوں کہ اپنی محدود معلومات کی روشنی میں جن نتائج تک پہنچا ہوں، ان سے دست بردار نہ ہوں۔ یورپ کے محققوں نے بدھ مذہب کے مصادر کی جستجو و فراہمی میں بڑی کد و کاوش کی ہے اور پالی زبان کے تمام اہم مصادر فرنچ یا انگریزی میں منتقل کر لئے ہیں۔ میں نے حتی الامکان ان تمام مواد کے مطالعہ کی کوشش کی اور بالآخر اسی نتیجہ تک پہنچا۔

اور اُس کی جگہ نئے نئے تصوروں اور مخلوط عقیدوں نے لے لی تھی ۔ اب مسیحی مذہب کے اقانیم ثلاثہ کی طرح جو پانچ سو برس بعد ظہور میں آنے والا تھا۔ ایک شمنی اقانیم کا عقیدہ بدھ کی شخصیت کے گرد ہالے کی طرح چمکنے لگا۔ اور عام انسانی سطح سے وہ ماوراء تسلیم کر لی گئی ۔ یعنی بدھ کی ایک شخصیت کے اندر تین وجودوں کی نمود ہو گئی ۔ اس کی تعلیم کی شخصیت ، اس کے دنیاوی وجود کی شخصیت اس کے حقیقی وجود کی شخصیت ، یہ آخری شخصیت لوک (بہشت) میں رہتی ہے ۔ دنیا میں جب کبھی بدھ کا ظہور ہوتا ہے ۔ تو یہ اسی حقیقی وجود کا پرتو ہوتا ہے ۔ نجات پانے کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی حقیقی بدھ کے اسی ماوراء عالم مسکن میں پہنچ جائے ۔

پہلی صدی مسیحی میں بعہد کوشاں جب چوتھی مجلس برشاور (پشاور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب بنیادی مذہب کی جگہ ایک طرح کا کلیسائی مذہب قائم ہو چکا تھا ۔ اور بدھ کے اشٹانگ مارگ (طریق ثمانیہ) کی عملی روح طرح طرح کی رسوم پرستیوں اور قواعد آرائیوں میں معدوم ہو چکی تھی ۔

بالآخر پیروانِ بدھ دو بڑے فرقوں میں بٹ گئے "ہینیان" اور "مہایان" پہلا فرقہ بدھ کی شخصیت میں ایک رہنما اور معلّم کی انسانی شخصیت دیکھنی چاہتا تھا ، لیکن دوسرے نے اسے پوری طرح ماوراء انسانیت کی ربانی سطح پر متمکن کر دیا تھا ، اور پیروانِ بدھ کی عام راہ وہی ہو گئی تھی افغانستان ، بامیان ، وسط ایشیا ، چین ، کوریا ، جاپان ، تبت ، سب میں مہایان مذہب ہی کی تبلیغ و اشاعت ہوئی ۔ چینی سیاح فاہیان جب چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان آیا تھا تو اس نے یورپ کے ہینیان شمنیوں سے مباحثہ کیا تھا اور مہایان طریقہ کی صداقت کے دلائل پیش کئے تھے موجودہ زمانے میں سیلون کے سوا جہاں ہینیان طریقے کا ایک محرّف بقیہ "تھیرا واد" کے نام سے پایا جاتا ہے ، تمام پیروانِ بدھ کا مذہب مہایان ہے

موجودہ زمانے کے بعض محققین شمنیہ کا خیال ہے کہ اشوک کے زمانہ تک بدھ مذہب میں بت پرستی کا عام رواج نہیں ہوا تھا ۔ کیونکہ اس عہد تک کے جو بدھ آثار ملتے ہیں ۔ اُن میں بدھ کی شخصیت کسی بُت کے ذریعہ نہیں بلکہ صرف ایک کنول کے پھول یا ایک خالی کرسی کی شکل میں دکھائی گئی ہے پھر کنول اور خالی کرسی کی جگہ دو قدم نمودار ہونے لگے ۔ اور پھر بتدریج قدموں کی جگہ خود بودھ کا پورا مجسمہ نمودار ہو گیا ۔ اگر یہ استنباط صحیح تسلیم کر لیا جائے ۔ جب بھی ماننا پڑے گا کہ اشوک کے زمانے کے بعد بودھ کے بتوں کی عام پرستش جاری ہو گئی تھی ۔ اشوک کا عہد ۲۵۰ سنہ قبل از مسیح تھا ۔

(۲) ایرانی مجوسی تصور

زردشت کے ظہور سے پہلے ماد (میڈیا) اور پارس میں ایک قدیم ایرانی[1] طریق پرستش رائج تھا ۔ ہندوستان کے ویدوں میں دیوتاؤں کی پرستش اور قربانیوں کے اعمال و رسوم جس طرح کے پائے جاتے ہیں ۔ قریب قریب ویسے ہی عقاید و رسوم پارس اور ماد میں بھی پھیلے ہوئے تھے ۔ دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے

[1] "ایرایان" وہی لفظ ہے جو ہندوستان میں "آریا" ہو گیا ۔ اوستا میں جن ملکوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے ، جن میں سب سے پہلا اور سب سے بہتر "ایریانا ویجو" ہے اور غالباً اس سے شمالی ایران مقصود ہے (وندیداد ۔ فرگرد اول ۔ فقرہ ۲) ہرمزدیشت کے فقرہ ۲۱ میں بھی "ایریانا ویجو" کا ذکر کیا ہے اور اس پر درود بھیجا ہے ۔ "ویجو" جرمن مستشرق اسپیگل کی قراءت ہے ۔ آنکتیل نے اسے "ویگو" پڑھا تھا ۔ "ویجو" یا "ویگو" کے معنی پہلوی میں مبارک کے ہیں ۔ یعنی مبارک ایریانا کی سرزمین ۔

مظہروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی دوسری برائی کے تمام عفریتوں کی تھی جو ہر طرح کی مصیبتوں اور ہلاکتوں کا سرچشمہ تھی۔ آگ کی پرستش کے لئے قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور ان کے پجاریوں کو "موگوش" کے نام سے پکارا جاتا تھا اوستا کے گاتھا میں انہیں "کارپان" اور "کاوی" کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی "موگوش" نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا اور غیر قومیں ایرانیوں کو "مگ" اور "مگوش" کے نام✤ سے پکارنے لگیں۔ عربوں نے اسی "موگوش" کو "مجوس" کر دیا۔

مزدیسنا

زردشت کا جب ظہور ہوا تو اس نے ایرانیوں کو ان قدیم عقائد سے نجات دلائی۔ اور "مزدیسنا" کی تعلیم دی۔ یعنی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد "اہورامزد" کی پرستش کی۔ یہ اہورامزد یگانہ ہے، بے ہمتا ہے، بے مثال ہے۔ نور ہے، پاکی ہے، سرتاسر حکمت اور خیر ہے، اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ اس نے انسان کے لئے دو عالم بنائے، ایک عالم دنیوی زندگی کا ہے۔ دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ مرنے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے۔ مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتی ہے۔

دیوتاؤں کی جگہ اس نے "امیش سپند" اور "یزتا" کا تصور پیدا کیا۔ یعنی فرشتوں کا۔ یہ فرشتے اہورامزد کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ برائی اور تاریکی کی طاقتوں کی جگہ "انگرامے نیوش" کی ہستی کی نمود کی۔ یعنی شیطان کی۔ یہی "انگرامے نیوش" پاژند کی زبان میں "اہرمن" ہو گیا۔

زردشت کی تعلیم میں ہندوستانی آرائیوں کے ویدی عقائد کا رد صاف نمایاں ہے۔ ایک ہی نام ایران اور ہندوستان دونوں جگہ ابھرتا ہے اور متضاد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ اوستا کا "اہورا" سام اور یجر وید میں "اسورا" ہے، اگرچہ رگ وید میں اس کا اطلاق اچھے معنوں پر ہوا تھا۔ مگر اب وہ برائی کی شیطانی روح بن گیا ہے۔ ویدوں کا "اندرا" اوستا کا "انگرا" ہو گیا۔ ویدوں میں وہ آسمان کا خدا تھا۔ اوستا میں زمین کا شیطان ہے۔ ہندوستان اور یورپ میں "دیو" اور "ڈے یوس" اور "تھیوس" خدا کے لئے بولا گیا، لیکن ایران میں "دیو" کے معنی عفریتوں کے ہو گئے۔ گویا دونوں عقیدے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا خدا دوسرے کا شیطان ہو جاتا تھا، اور دوسرے کا شیطان پہلے کے لئے خدا کا کام دیتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں "یم" موت کی طاقت ہے۔ اوستا کی روایتوں میں "یم" زندگی اور انسانیت کی سب سے بڑی نمود ہوئی اور پھر یہی "یم" ہو کر جمشید ہو گیا!

فسانہا کہ بباز یچۂ رزہ گاہ مرزہ
کنوں بہ مسندِ جمشید و تاجِ کے بستند

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند صدیوں کے بعد ایران کے قدیم تصورات اور بیرونی اثرات پھر غالب آ گئے، اور ساسانی عہد میں جب "مزدیسنا" کی تعلیم کی از سر نو تدوین ہوئی تو یہ قدیم مجوسی یونانی اور زردشتی عقائد کا ایک مخلوط مرکب تھا، اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسی تصور ہی نے فراہم کیا تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو یہی مخلوط تصور ایران کا قومی مذہبی تصور تھا۔ مغربی ہند کے پارسی مہاجر یہی تصور اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اور پھر یہاں کے مقامی اثرات کی ایک تہہ اس پر اور چڑھ گئی۔

مجوسی تصور کی بنیاد ثنویت (DUALISM) کے عقیدہ پر تھی۔ یعنی خیر اور شر کی دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ اہورامزد جو کچھ کرتا ہے۔ انگرامے نیوش یعنی اہرمن جو کچھ

کرتا ہے شر اور تاریکی ہے۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفات کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مجوسی تصور نے خیر اور شر کی گتھی یوں سلجھانی چاہی کہ کارخانۂ ہستی کی سر براہی دو متقابل اور متعارض قوتوں میں تقسیم کر دی۔

(۴) یہودی تصوّر

یہودی تصوّر ابتداء میں ایک محدود نسلی تصوّر تھا۔ یعنی کتاب پیدائش کا یہوا خاندانِ اسرائیل کے نسلی خدا کی حیثیت سے نمایاں ہوا تھا۔ لیکن پھر یہ تصوّر بتدریج وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یشعیا دوم[1] کے صحیفہ میں "تمام قوموں کا خدا"، اور "تمام قوموں کا ہیکل" نمایاں ہوگیا۔ تاہم "اسرائیلی خدا" کا نسلی اختصاص کسی نہ کسی شکل میں برابر کام کرتا رہا، اور ظہورِ اسلام کے وقت اس کے نمایاں خال وخط نسل اور جغرافیے ہی کے خال وخط تھے۔

تجسم اور تنزیہہ کے اعتبار سے وہ ایک درمیانی درجہ رکھتا تھا، اور اس میں غالب عنصر قہر و غضب اور انتقام و تہذیب کا تھا۔ خدا کا بار بار متشکل ہوکر نمودار ہونا۔ تخاطبات کا تمام تر انسانی اوصاف و جذبات سے آلودہ ہونا، قہر و انتقام کی شدت، اور ابتدائی درجہ کا تمثیلی اسلوب تورات کے صحیفوں کا عام تصوّر ہے۔

خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیت کا رشتہ ہوا، جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ شوہر نہایت غیور ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دے گا۔ لیکن یہ جرم معاف نہیں کرے گا کہ اس کی محبت میں کسی دوسرے مرد کو بھی شریک کرے۔ اسی طرح خاندان اسرائیل کا خدا بھی بہت غیور ہے۔ اس نے اسرائیل کے گھرانے کو اپنی چہیتی بیوی بنایا، اور چونکہ چہیتی بیوی بنایا، اس لئے خاندان اسرائیل کی بے وفائی اور غیر قوموں سے آشنائی اس پر بہت شاق گذرتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ وہ اس جرم کے بدلے سخت سزائیں دے۔ چنانچہ احکام عشرہ (TEN COMMANDMENTS) میں ایک حکم یہ بھی تھا۔ "تو کسی چیز کی صورت نہ بنائیو۔ اور نہ اس کے آگے جھکیو۔ کیونکہ میں خداوند تیرا رشک کرنے والا ایک بہت ہی غیور خدا ہوں!" (خروج - ۲۱)

شوہر کے رشتہ کی یہ تمثیل جو مصر سے خروج کے بعد متشکل ہونا شروع ہوگئی تھی، آخر عہد تک کم و بیش قائم رہی۔ یہودیوں کی ہر گمراہی پر خدا کے غضب کا اظہار ایک غضبناک شوہر کا پرجوش اظہار ہوتا ہے جو اپنی چہیتی بیوی کو اس کی ایک ایک بے وفائی یاد دلا رہا ہو۔ یہ اسلوب تمثیل بظاہر کتنا ہی مؤثر اور شاعرانہ دکھائی دیتا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا کے تصور کے لئے ایک ابتدائی درجہ کا غیر ترقی یافتہ تصور تھا۔

(۵) مسیحی تصوّر

لیکن یشعیا دوم کے زمانے سے اس صورتِ حال میں تبدیلی شروع ہوئی اور یہودی تصور میں بہ یک وقت وسعت اور لطافت، دونوں طرح کے عناصر

---

[1] عہد عتیق میں شعیا نبی کی طرف جو کتاب منسوب ہے، اس کی زبان اور مطالب کا آیت: ۱۵ تک ایک خاص انداز ہے، اور پھر اس کے بعد بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حصہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو قید بابل سے پہلے تھا لیکن بعد کے حصہ میں قید بابل کے زمانہ کے اثرات صاف صاف نمایاں ہیں۔ اس لئے انیسویں صدی کے نقادوں نے اسے دو شخصوں کے کلام میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو یشعیا اول اور دوسرے کو دوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

نمایاں ہونے لگے۔ گویا اب ایک نئی تصوری فضا کے لئے زمانے کے مزاج طیار ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مسیحیت آئی تو رحم و محبت اور عفو و بخشش کا ایک نیا تصور لے کر آئی۔ اب خدا کا تصور نہ تو جابر بادشاہ کی طرح قہر آلود تھا۔ نہ رشک و غیرت میں ڈوبے ہوئے شوہر کی طرح سخت گیر تھا۔ بلکہ باپ کی محبت و شفقت کی مثال نمایاں کرتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہودی تصور کی شدّت و غلظت کے مقابلے میں رحم و محبت کی رقت کا یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ انسانی زندگی کے سارے رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ سب سے بلند تر رشتہ ہے۔ اس میں شوہر کے رشتہ کی طرح جذبوں اور خواہشوں کی غرضوں کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ سرتاسر رحم و شفقت اور پرورش و چارہ سازی ہوتی ہے۔ اولاد بار بار قصور کرے گی لیکن ماں باپ کی محبت پھر گردن نہیں موڑے گی اور باپ کی شفقت پھر بھی معافی سے انکار نہیں کرے گی۔ پس اگر خدا کے تصور کے لئے انسانی رشتوں کی مشابہتوں سے کام لئے بغیر چارہ نہ ہو تو بلاشبہ شوہر کی تمثیل کے مقابلہ میں باپ کی تمثیل کہیں زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تمثیل ہے[1]۔

تجسم اور تنزّہ کے لحاظ سے مسیحی تصور کی سطح اصلاً وہی ہے جہاں تک یہودی تصور پہنچ چکا تھا، مگر جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تصوروں سے امتزاج ہوا، تو اقانیم ثلاثہ، کفارہ، اور مسیح پرستی کے تصورات چھا گئے، اور اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تصوّر سراپیر (SERAPI) نے مسیحی اصنامی تصور کی شکل اختیار کر لی۔ اب مسیحیت کو بت پرستوں کی بت پرستی سے تو انکار تھا لیکن خود اپنی بت پرستی پر اعتراض نہ تھا۔ میڈونا کے قدیم بت کی جگہ اب ایک نئی مسیحی میڈونا کا بت طیار ہو گیا۔ یہ خدا کے فرزند کو گود میں لئے ہوئے تھی، اور ہر راسخ الاعتقاد مسیحی کی جبین نیاز کا سجدہ طلب کرتی تھی!

غرضیکہ قرآن کا جب نزول ہوا تو مسیحی تصوّر رحم و محبت کی پدری تمثیل کے ساتھ اقانیم ثلاثہ، کفارہ، اور تجسم کا ایک مخلوط اشراکی۔ توحیدی تصور تھا۔

فلاسفۂ یونان و اسکندریہ کا تصور

ان تصوروں کے علاوہ ایک تصوّر فلاسفۂ یونان کا بھی ہے جو اگرچہ مذاہب کے تصوروں کی طرح اقوام عالم کا تصوّر نہ ہو سکا، تاہم انسان کی فکری نشو و نما کی تاریخ میں اس نے بہت بڑا حصّہ لیا، اور اس لئے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تقریباً پانچ سو برس قبل از مسیح یونان میں توحید کا تصور نشو و نما پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط (SOCRATS.) کی حکمت میں نمایاں ہوئی، جسے افلاطون (PLATO) نے تدوین و انضباط کے جامے سے آراستہ کیا۔

جس طرح ہندوستان میں رگ وید کے ویدیانی تصوّرات نے بالآخر ایک ربّ الاربابی تصور کی نوعیت پیدا کر لی تھی، اور پھر اسی ربُّ الاربابی تصوّر نے بہ تدریج تصور کی طرف قدم بڑھایا تھا، ٹھیک اسی طرح یونان میں بھی المپس کے دیوتاؤں کو بالآخر ایک ربُّ الارباب ہستی کے آگے جھکنا پڑا، اور پھر یہ ربُّ الاربابی تصور بہ تدریج کثرت سے وحدت قدم بڑھانے لگا۔ یونان

[1] اسی لئے ہندو تصور نے ماں کی تشبیہ سے کام لیا۔ کیونکہ ماں کی تشبیہ میں اگرچہ نسائیت آجاتی ہے لیکن تشبیہ باپ سے بھی زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے۔ باپ کی شفقت کبھی کبھی جواب دے دیگی لیکن ماں کی محبت کی گہرائیوں کے لئے کوئی تھاہ نہیں!۔

کے قدیم ترین تصوّروں کے معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ اُس کی پُرانی شاعری ہے۔ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو عقیدے برابر پسِ پردہ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی، اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی الوہیت۔

آئیونی (TONIE) فلسفہ نے جو یونانی مذہبِ فلسفہ میں سب سے زیادہ پرانا ہے، اجرام سماوی کی ان دیکھی روحوں کا اعتراف کیا تھا۔ اور پھر ان روحوں کے اوپر کسی ایسی رُوح کا سراغ لگانا چاہا تھا جسے اصل کائنات قرار دیا جا سکے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں فیثاغورس (PYTHAGORAS.) کا ظہور ہوا۔ اور اس نے نئے نئے فکری عنصروں سے فلسفہ کو آشنا کیا۔ فیثاغورس کے سفرِ ہند کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے فلسفیانہ تصوروں میں ہندوستانی طریقِ فکر کی مشابہتیں پوری طرح نمایاں ہیں۔ تناسخ کا غیر مشتبہ عقیدہ پانچویں آسمانی عنصر (BUINTACE SSENTIA) کا اعتراف، نفسِ انسانی کی انفرادیت کا تصور مکاشفاتی طریق ادراک کی جھلک، اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک "طریقِ زندگی" کے ضابطہ کا اہتمام، ایسے مبادیات ہیں جو ہمیں اوپانی شد کے دائرۂ فکر و نظر سے بہت قریب کر دیتے ہیں۔ فیثاغورس کے بعد انکساغورس (ANXAGORAS) نے ان مبادیات کو کلیّاتی (ABSTRACTS.) تصورات کی نوعیت کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی فلسفے کی وہ بنیاد استوار ہو گئی جس پر آگے چل کر سقراط اور افلاطون اپنی کلیّاتی تصوریت کی عمارتیں کھڑی کرنے والے تھے۔

سقراط کی شخصیت میں یونان کے توحیدی اور تنزیہی اعتقاد کی سب سے بڑی نمود ہوئی سقراط سے پہلے جو فلسفی گزرے تھے، انہوں نے قومی پرستش گاہوں کے دیوتاؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ خود ان کے دل و دماغ بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں ہوئے تھے۔ نفوسِ فلکی کے تصورات کی اگر اصل حقیقت معلوم کی جائے تو اس سے زیادہ نہیں نکلے گی کہ یونان کے کو اکبی دیوتاؤں نے علم و نظر کے حلقوں سے روشناس ہونے کے لئے ایک نیا فلسفیانہ نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا تھا، اور اب ان کی ہستی صرف عوام ہی کو نہیں بلکہ فلسفیوں کو بھی تسکین دینے کے قابل بنا دی گئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی صورتِ حال تھی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کے صفحوں پر دیکھ رہے تھے۔ یعنی فکری غور و خوض کے نتائج ایک ایسی لچکدار صورت میں ابھرنے لگے۔ کہ ایک طرف فلسفیانہ دماغوں کے تقاضوں کا بھی جواب دیا جا سکے، دوسری طرف عوام کے قومی عقائد سے بھی تصادم نہ ہو۔ ہندوستان کی طرح یونان میں بھی خواص اور عوام کے فکر و عمل نے باہم دگر سمجھوتا کر لیا تھا۔ یعنی توحیدی اور اصنامی عقیدے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے!

لیکن سقراط کا معنوی علوِ فکر اس عام سطح سے بہت بلند جا چکا تھا۔ وہ وقت کے اصنامی عقائد سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکا۔ اس کا توحیدی تصور تجسّم اور تشبہ کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر اُبھرا۔ اُس کی بے لوث خدا پرستی کا تصور اس درجہ بلند تھا کہ وقت کے عام مذہبی تصورات اُسے سر اُونچا کر کے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس کی حقیقت شناس نگاہ میں یونان کی اصنامی خدا پرستی اس سے زیادہ کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی تھی کہ ایک طرح کا دکاندارانہ لین دین تھا جو اپنے خود ساختہ معبودوں کے ساتھ چکایا تھا۔ افلاطون یوثی فرا (EUTMYPHRO) کے مکالمہ میں ہمیں صاف صاف بتلاتا ہے کہ یونان کے دینی تصورات و اعمال کی نسبت سقراط کے بے لاگ فیصلے کیا تھے؟

سقراط پر مذہبی بے احترامی کا الزام لگایا تھا، وہ پوچھتا ہے کہ "مذہبی احترام" کی حقیقت کیا ہے؟ پھر جو جواب ملتا ہے، وہ اُسے اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ "مذہبی احترام گویا مانگنے اور دینے کا ایک فن ہوا۔ دیوتاؤں سے وہ چیز مانگنی جس کی ہمیں خواہش ہے، اور انہیں وہ چیز دینی جس کی انہیں احتیاج ہے مختصراً یہ کہ تجارتی کاروبار کا ایک خاص ڈھنگ"

ایسی بے پروہ تعلیم کے وقت کے دارو گیر سے بچ نہیں سکتی تھی اور نہ بچی، لیکن سقراط کی اولوالعزم روح وقت کی کوتاہ اندیشیوں سے مغلوب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ایک ایسے صبر و استقامت حق کے ساتھ جو صرف نبیوں اور شہیدوں ہی کے اندر گھر بنا سکتا ہے، زہر کا جام اٹھایا اور بغیر کسی تلخ کلامی کے پی لیا۔

تمنت سلیمی ان نموت بحبّھا واھون شیٔ عندنا ما تمنّت!

اس نے مرنے سے پہلے آخری بات جو کہی تھی، وہ ایک کمتر دنیا سے ایک بہتر دنیا کی طرف جا رہا ہے!"

افلاطون نے سقراط کے باحثانہ (DIALECTIC) افکار کو جو ایک معلم کے درس و املا کی نوعیت رکھتے ہیں، ایک مکمل ضابطہ کی شکل دے دی اور منطقی تحلیل کے ذریعہ انہیں کلیات و جوامع کی صورت میں مرتب کیا۔ اس نے اپنے تمام فلسفیانہ بحث و نظر کی بنیاد کلیات (TRACPS ACS) پر رکھی اور حکومت سے لے کر خدا کی ہستی تک، سب کو تصوریت (IDEA) کا جامہ پہنا دیا۔ اگر تصوریت محسوسات سے الگ ہستی رکھتا ہے، اور اگر نفس مادہ سے الگ ہستی رکھتا ہے تو خدا کی ہستی بھی مادیات سے الگ اپنی نمود رکھتی ہے تو "نادِس[1]" (NEAUSE) یعنی نفس ناطقہ بھی مادہ سے الگ اپنی ہستی رکھتا ہے، اور اگر نفس مادہ سے الگ ہستی رکھتا ہے تو خدا کی ہستی بھی مادیات سے الگ اپنی نمود رکھتی ہے۔ اس نے انکساغورس کے مسلک کے خلاف دو نفسوں میں امتیاز کیا۔ ایک کو فانی قرار دیا۔ دوسرے کو لافانی۔ فانی نفس خواہشیں رکھتا ہے اور وہی مجسم ایجو (EGO) ہے۔ لیکن لافانی نفس کائنات کی اصل عاقلہ ہے اور جسمانی زندگی کی تمام آلائشوں سے یک قلم منزہ۔ یہی نفس کلی کی وہ الٰہی چنگاری ہے۔ جس نے انسان کے اندر قوت مدرکہ کی روشنی کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر نفس کلی کا تصور بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجودی تصور کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے۔ در اصل ہندو فلسفے کا "آتما" اور یونانی فلسفے کا "نفس" ایک ہی مسمیٰ کے دو نام ہیں۔ یہاں "آتما" کے بعد "پرم آتما" نمودار ہوا تھا۔ وہاں نفس کے بعد نفس کلی نمودار ہوا۔

سقراط نے خدا کی ہستی کے لئے "اگاتھوس" (AXAOOS.) یعنی "الخیر" کا تصور قائم

---

[1] "نادس" جس کا تلفظ "ناؤز" کیا جاتا ہے عربی کے "نفس" سے اس درجہ صوتی مشابہت رکھتا ہے "ناؤز" تعریب کا جامہ پہن کر "نفس" ہو گیا۔ اسی طرح "نوئٹک" (NOCTiC) اور "ناطق" اس درجہ قریب ہیں کہ دوسرے کو پہلے کے تعریب سمجھا سکتے ہے چنانچہ ریحان اور وزی نے نفس ناطقہ کو "نوئٹک ناؤز" کا معرب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ناطق" "نطق" سے نہیں ہے بلکہ "نوئٹک" کی تعریب ہے جس کے معنی ادراک کے ہیں بعض عربی مصادر سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے کہ اصل یونانی الفاظ پیش نظر رکھے گئے تھے۔

"نفس" عربی لغت میں ذات اور خود کے معنی میں بولا جاتا تھا اور ارسطو نے عاقلانہ نطق کو انسان کی فصل قرار دیا تھا۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب مترجموں نے یونانی تعبیر سامنے رکھ کر نفس ناطقہ کی ترکیب اختیار کر لی، اور یہ تعریب خود عربی الفاظ کے مدلول سے بھی ملتی جلتی ہوئی بن گئی۔

قائم کیا تھا۔ وہ سرتا سر اچھائی اور حسن ہے۔ افلاطون وجود کی بنیادوں سے بھی اوپر اٹھا۔ اور اس نے خیر بحت کا سراغ لگانا چاہا، لیکن سقراط کے صفاتی تصور پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔

ارسطو (ARISTOTLE) جس نے فلسفے کو روحانی تصوروں سے خالص کرکے صرف مشاہدہ و احساسات کے دائرہ میں دیکھنا چاہا تھا، اس سقراطی تصور کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے عقلِ اول اور عقلِ فعال کا تصور قائم کیا جو ایک ابدی، غیر متجزّی، اور بسیط بحت ہستی ہے۔ پس گویا سقراط اور افلاطون نے جس ذات کی صفت "الخیر" میں دیکھی تھی ارسطو نے اسے "العقل" میں دیکھا، اور اس منزل پر پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے زیادہ جو کچھ مشائی فلسفے (PERIPATETIC) میں ہمیں ملتا ہے، وہ خود ارسطو کی تصریحات نہیں ہیں اس کے یونانی اور عرب شارحوں کے اضافے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ "الخیر" اور "العقل" یونانی فلسفے کے تصورِ الوہیت کا ماحصل ہے۔

سقراط کے صفاتی تصوّر کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ افلاطون کی جمہوریت (REPUBLIC) کا حسب ذیل مکالمہ پیش نظر رکھا جائے۔ اس مکالمہ میں اس نے تعلیم کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔

اڈیمنٹس[1] نے سوال کیا کہ شاعروں کو خدا کا ذکر کرتے ہوئے کیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہئے۔

سقراط: ہر حال میں خدا کی توصیف ایسی کرنی چاہیئے جیساکہ وہ اپنی ذات میں ہے۔ خواہ رزمی (EPIC) شعر ہو خواہ غنائی (LYRIC) علاوہ بریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات صالح ہے۔ پس ضروری ہے کہ اُس کی صفات بھی صلاح پر مبنی ہوں۔

اڈیمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود صالح ہوگا، اُس سے کوئی بات مضر صادر نہیں ہوسکتی اور جو ہستی غیر مضر ہوگی، وہ کبھی شر کی صانع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو ذات صالح ہوگی، ضروری ہے کہ نافع بھی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ خدا صرف خیر کی علت ہے، شر کی علت نہیں ہوسکتا۔

اڈیمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خدا کا تمام حوادث کی علت ہونا ممکن نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ انسانی حالات کے بہت ہی تھوڑے حصے کی علت ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں، ہماری بُرائیاں بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں، اور بُرائیوں کی علت خدا کی صالح اور نافع ذات نہیں ہوسکتی۔ پس چاہیئے کہ صرف اچھائی ہی کو اُس کی طرف نسبت دیں اور بُرائی کی

---

[1] جمہوریت کے اشخاص مکالمہ میں "اڈیمنٹس" اور "گلوکن" افلاطون کے بھائی ہیں۔ چنانچہ افلاطون نے خود ایک جگہ تصریح کی ہے — افلاطون کی دوسری مصنفات کے ساتھ جمہوریت کا ترجمہ بھی عربی میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد نے اس کی شرح لکھی۔ شرح کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب السیاسہ کی شرح لکھنی چاہی تھی مگر اندلس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ مجبوراً افلاطون کی کتاب اختیار کرنی پڑی۔ ابن رشد کی شرح کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ میں موجود ہیں۔ مگر اصل عربی ناپید ہے۔ یورپ کے موجودہ تراجم براہ راست یونانی سے ہوئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اے۔ ای۔ ٹیلر اور بی جوویٹ (JOWETT) کے انگریزی تراجم ہیں۔

علت کسی دوسری جگہ ڈھونڈھیں۔

اڈمنٹس: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے۔

سقراط: تو اب ضروری ہوا کہ ہم شاعروں کے ایسے خیالات سے متفق نہ ہوں - جیسے ہومر کے حسب ذیل شعروں میں ظاہر کئے گئے ہیں "مشتری[1] کی ڈیوڑھی میں دو پیالے رکھے ہیں - ایک خیر کا ہے - ایک شر کا اور یہی انسان کی بھلائی اور برائی تمام تر علت ہیں - جس انسان کے حصے میں خیر کے پیالے کی شراب آ گئی، اس کے لئے تمام تر خیر ہے - جس کے حصے میں شر کی آئی اس کے لئے تمام تر شر ہے - اور پھر جس کسی کو دونوں پیالوں کا ملا جلا گھونٹ مل گیا اس کے حصے میں اچھائی بھی آ گئی اور برائی بھی[2]"

پھر اس کے بعد تجسّم کے عقیدہ پر بحث کی ہے اور اس سے انکار کیا ہے کہ "خدا ایک بازیگر اور بہروپیے کی طرح کبھی ایک بھیس میں نمودار ہوتا ہے کبھی دوسرے بھیس میں[3]"

اسکندریہ کا مذہب افلاطون جدید

تیسری صدی مسیحی میں اسکندریہ کے فلسفۂ تصوف نے "مذہب افلاطون جدید" (NEO-PLATONIC) کے نام سے ظہور کیا۔ جس کا بانی امونیس سکاس (AMMON-USSACCBS) تھا - امونیس کا جانشین فلاطینس (PLATINUS) ہوا اور فلاطینس کا شاگرد فورفوریوس (PORPHYRY) جو اسکندر افرودسی کے بعد ارسطو کا سب سے بڑا شارح تسلیم کیا گیا ہے، اور جس نے افلاطونیۂ جدیدہ کی مبادیات مشائی فلسفے میں مخلوط کر دیں - فلاطینس اور فورفوریس کی تعلیم سرتا سر اسی اصل پر مبنی تھی جو ہندوستان میں اوپانی شد کے مذہب نے اختیار کی ہے - یعنی علم حق کا اصلی ذریعہ کشف ہے - نہ کہ استدلال، اور معرفت کا کمال مرتبہ یہ ہے کہ جذب و فنا کا مقام حاصل ہو جائے -

خدا کی ہستی کے بارے میں فلاطینس بھی اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر اوپانی شد کے مصنف اس سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے - یعنی نفی ثبات کا مسلک اس نے بھی اختیار کیا - ذات مطلق ہمارے تصوّر و ادراک کی تمام تعبیرات سے ماوراء ہے - اس لئے ہم اس بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے - وہ ذات مطلق ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں جو اس سے ظہور میں آئیں - ہم اس کی نسبت کوئی حکم نہیں لگا سکتے - ہم نہ تو اسے موجودیت سے تعبیر کر سکتے ہیں - نہ جوہر

---

[1] مشتری یعنی "زیوس" (ZEUS) یونان کے اصنامی عقائد میں ربّ الارباب یعنی دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور حکمران دیوتا تھا - ہومر نے ایلیڈ میں دیوتاؤں کی جو مجلس آراستہ کی ہے، اس میں تخت نشین ہستی مشتری ہی کی ہے -

[2] یہ اشعار ایلیڈ کے ہیں - سلیمان بستانی نے اپنے بے نظیر ترجمہ عربی میں ان کا ترجمہ حسب ذیل شعروں میں کیا ہے -

فباعتاب زفس قد اودرتان — ذی الخیر وذی الشر المهوان

فیهما کل قسمة الانسان

فالذی منهما مزیجاً انالا — زفس یلقی خیراً ویلقی وبالا

والذی لا ینال الا من الشر — فتنتابه الخطوب انتیابا

بطواه یطوی البلاد کلیلا — تائهاً عرض الفلاة ذلیلا

من بنی الخلد والوری مخذولا — (الیاذہ۔ نشید ۲۴، صفحہ ۱۱۳۱)

ان اشعار میں "زفس" یونانی "زیوس" کی تعریب ہے -

[3] دی ریپبلک ترجمہ ٹیلر۔ باب ۲

سے۔ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہے۔ حقیقت ان تمام تعبیروں سے وراء الوراء ہے"[1]

سقراط اور افلاطون نے حقیقت کو "الخیر" سے تعبیر کیا تھا۔ اس لئے فلاطینس وہاں تک بڑھنے سے انکار نہ کر سکا لیکن اس سے آگے کی تمام راہیں بند کر دیں "جب تم نے کہا "الخیر" تو بس یہ کہہ کر رُک جاؤ اور اس پر اور کچھ نہ بڑھاؤ۔ اگر تم کسی دوسرے خیال کا اضافہ کرو گے تو ہر اضافہ کے ساتھ ایک نئے نقص کی اس سے تقریب کرتے جاؤ گے"[2] ارسطو نے حقیقت کا سراغ عقول مجردہ کی راہ سے لگایا تھا، اور علۃ العلل کو عقل اوّل سے تعبیر کیا تھا، مگر فلاطینس کا منطق اس تعبیر کی گرانی بھی برداشت نہیں کر سکتا "یہ بھی مت کہو کہ وہ عقل ہے۔ تم اس طرح اسے منقسم کرنے لگو گے"[3]

لیکن اگر ہم "عقل" کا اطلاق اس پر نہیں کر سکتے تو پھر "الوجود" اور "الخیر" کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ اگر ہم اپنے متصورہ صفتوں میں سے کوئی صفت بھی اس کے لئے نہیں بول سکتے، تو پھر وجودیت اور خیریت کی صفات بھی کیوں ممنوع نہ ہوں؟ اس اعتراض کا وہ خود جواب دیتا ہے۔

"ہم نے اگر اُسے "الخیر" کہا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کوئی باقاعدہ تصدیق کسی خاص وصف کی کرنی چاہتے ہیں جو اس کے اندر موجود ہے۔ ہم اس تعبیر کے ذریعہ صرف یہ بات واضح کرنی چاہتے ہیں کہ وہ ایک مقصد اور منتہیٰ ہے۔ جس پر تمام سلسلے جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک اصطلاح ہوئی جو ایک خاص غرض کے لئے کام میں لائی گئی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اُس کی نسبت وجود کا حکم لگاتے ہیں تو صرف اس لئے کہ عدم کے دائرہ سے اُسے باہر رکھیں وہ تو ہر چیز سے ماوراء ہے۔ حتیٰ کہ وجود کے اوصاف و خواص سے بھی"[4]

اسکندریہ کے کلیمنٹ (CLEMENT) نے اس مسلک کا خلاصہ چند لفظوں میں کہہ دیا "اس کی شناخت اس سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ کیا ہے؟ صرف اس سے کی جا سکتی ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں ہے!"

---

[1] S-T-MEKENNA جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۴ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] ایضاً جلد اول صفحہ ۱۱۸۔ مذہب افلاطون جدید افلاطون کی طرف اس لئے منسوب ہوا کہ اس کی بنیاد بعض افلاطونی مبادیات پر رکھی گئی تھی مگر پھر اپنی بحث و نظر میں اس نے جو راہ اختیار کی اور جن نتائج تک پہنچا انہیں افلاطون سے کوئی تعلق نہیں لیکن عرب فلاسفہ کا ایک بڑا طبقہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ فی الحقیقت یہ افلاطون ہی کا مذہب ہے اس مذہب کے بعض فلسفیوں مثلاً فور فوریوس نے ارسطو کی شرح کرتے ہوئے اس کے مذہب میں جو اضافے کئے تھے اُسے بھی عرب حکماء اصل سے ممتاز نہ کر سکے۔ چنانچہ ابو نصر فارابی نے الجمع بین الرأیین میں ارسطو کا جو مذہب ظاہر کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ابن رشد پہلا عرب فلسفی ہے جس نے یہ غلط فہمی محسوس کی اور ارسطو کے مذہب کو شارحوں کے اضافے سے خالص کر کے دیکھنا چاہا۔

۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین کے حکم سے اسکندریہ کے فلاسفہ جلا وطن کئے گئے تو ان میں سے بعض نے ایران میں پناہ لی۔ چنانچہ سیمپلکس اور ڈیماسیس خسرو کے دربار میں معزز جگہ رکھتے تھے۔ ان فلاسفہ کی وجہ سے پہلوی زبان بھی مذہب افلاطون جدید سے آشنا ہو گئی اور ایرانی حکماء نے اسے قومی رنگ دینے کے لئے زردشت اور جاماسپ کی طرف منسوب کر دیا۔ عربی میں جب پہلوی ادبیات منتقل ہوئیں تو یہ فلسفیانہ مقالات بھی ترجمہ ہو گئے اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ زردشت اور جاماسپ کا ایک پر اسرار فلسفہ ہے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین نے حکمۃ الاشراق میں اور شیرازی نے اس کی شرح میں دونوں غلطیاں جمع کر دی ہیں۔ وہ مذہب افلاطونِ جدید کو افلاطون کا مذہب سمجھتے ہیں اور زردشت اور جاماسپ کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

یعنی یہاں صرف سلب و نفی کی راہ ملتی ہے۔ ایجاب و اثبات کی راہیں بند ہیں۔

سہ، لسان النطق عنہ اخرس

باب صفات میں یہ وہی بات ہوئی جو اوپانی شد کی "نیتی نیتی" میں ہم سن چکے ہیں، اور جس پر شنکر نے اپنے مذہب کی مبادیات کی تمام عمارتیں استوار کی ہیں:

از منۂ وسطیٰ کے یہودی فلاسفہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ موسیٰ بن میمون (المتوفی ۶۰۵ھ) خدا کو "الموجود" کہنے سے بھی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے، ہم جونہی "موجود" کا وصف بولتے ہیں، ہمارے تصور پر مخلوق کے اوصاف و خواص کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہے۔ اور خدا ان اوصاف سے منزہ ہے۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک کہا جائے کیونکہ "وحدت" اور "عدم شرکت" کے تصورات بھی اضافی نسبتوں سے خالی نہیں" ابن میمون کا یہ مسلک دراصل فلسفۂ اسکندریہ ہی کی بازگشت تھی۔

قرآنی تصور

بہر حال چھٹی صدی مسیحی میں دنیا کی خدا پرستانہ زندگی کے تصورات اس حد تک پہنچے تھے کہ قرآن کا نزول ہوا۔

اب غور کرو کہ قرآن کے تصورِ الٰہی کا کیا حال ہے؟ جب ہم ان تمام تصورات کے مطالعہ کے بعد قرآن کے تصور پر نظر ڈالتے ہیں، تو صاف نظر آجاتا ہے کہ تصورِ الٰہی کی تمام تصویروں میں اس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

(۱) تنزیہہ کی تکمیل

اوّلاً، تجسّم اور تنزیہہ کے لحاظ سے قرآن کا تصورِ تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے جس کا کوئی نمونہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہنِ انسانی متحمل ہو سکا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جائے، لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ ہندوستان اور یونان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، وہ بھی اس طرح کے تشبیہ و تمثل سے یکسر آلودہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا، خدا کا حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰؑ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوشِ غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا۔ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لینا اور پھر اس کی بدچلنی پر ماتم کرنا، ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا، تورات کا عام اسلوب بیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لئے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہہ ہی پر رکھنی پڑی۔ مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یشعیا کی کتاب میں خدا کے لئے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے، لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں جو سر تا سر انسانی اوصاف و جذبات کا تشبیہہ سے مملو نہ ہو۔ حضرت مسیحؑ نے جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں، تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لئے باپ کی تشبیہہ سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی، اور ابنیتِ مسیحؑ کا عقیدہ پیدا کر لیا۔

لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اچانک فکر و تصور کی ایک بالکل نئی دنیا سامنے آگئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہہ کے تمام پردے بہ یک دفعہ اٹھ جاتے ہیں۔ انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے، ہر گوشہ مجاز کی جگہ

حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے، اور تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ:-

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج (۴۲ : ۱۱)

اس کے مثل کوئی شے نہیں۔ کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے!

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶ : ۱۰۳)

انسان کی نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں؛ لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ج اَللّٰهُ الصَّمَدُ ج لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲ : ۱-۴)

اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اُسے کسی کی احتیاج نہیں۔ نہ تو اُس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کے درجے اور برابری کی ہوئی۔

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں، دقّتِ نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہِ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن وہاں خدا کی تجلّی کا ذکر کرتا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اترا، قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطورِ مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈال لی جائے۔ تورات میں ہے:

"خداوند نے کہا، اے موسیٰ دیکھ، یہ جگہ میرے پاس ہے تو اس چٹان پر کھڑا رہ، اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اُس چٹان کی دراڑ رکھوں گا، اور جب تک نہ گزر لوں گا۔ تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ میں ہتھیلی اٹھا لوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھ لے گا، لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا"! (خروج ۳۳ : ۲۰)

تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا"! (گنتی ۱۲ : ۵)

اسی معاملہ کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:-

قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ (۷ : ۱۳۹)

موسیٰ نے کہا، اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تاکہ میں تیری طرف نگاہ کر سکوں فرمایا نہیں، تو کبھی مجھے نہیں دیکھ سکتا! لیکن ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔

تنزیہہ اور تعطیل کا فرق

البتہ یاد رہے کہ تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے۔ صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہہ کے منع ونفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصوّر کے لئے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہہ کی تکمیل ہے۔ تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

بلا شبہ اپانی شد تنزیہہ کی "نیتی نیتی"[1] کو بہت دور تک لے گئے۔ لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نہ کہ ذاتِ مطلق (برہمان) کو ذاتِ متشخص (ایشور) میں اتارے بغیر کام نہ چل سکا۔

---

[1] "نیتی" یعنی کلمۂ نفی۔ وہ ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ برہد رینا ک اوپانی شد میں یہ نفی دور تک چلی گئی ہے۔ وہ کثیف ہے؟ "نہیں"۔ وہ لطیف ہے؟ "نہیں"۔ وہ کوتاہ ہے؟ "نہیں"۔ وہ دراز ہے؟ "نہیں"۔ غرض ہر مشابہت کے جواب میں "نہیں" دہرایا جاتا ہے۔ نہ وہ ایسا ہے۔ نہ ویسا ہے۔ نہ یہ ہے۔ نہ وہ ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من — خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر!

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح نفیِ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں تصور انسانی کے لئے ٹھوکر ہوئی۔ اگر تشبیہ اُسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے، تو تعطل اُسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ پس یہاں ضروری ہوا کہ افراط اور تفریط، دونوں سے قدم روکے جائیں، در تشبیہ اور تعطیل، دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے، اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے۔

اگر خدا کے تصور کے لئے صفات وافعال کی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی پکڑ میں آ سکتی ہے، تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائیں گے۔ یعنی اگر کہا جائے ہم خدا کے لئے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے، اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آ جائے گی، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکر انسانی کے لئے کوئی سررشتۂ تصور باقی نہیں رہے گا۔ اور کسی ایسی ذات کا تصور ہی نہیں کر سکے گا، اور جب تصور نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی پکڑ اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصور اگرچہ اثباتِ وجود کی کوشش کرے، لیکن فی الحقیقت وہ نفی وجود کا تصور ہوگا۔ کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعہ ہم ہستی کو نیستی سے جدا نہیں کر سکتے۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اُسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیتِ اعلیٰ کے درجہ تک پہنچنے کے لئے بلندی کے نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اُس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں نے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال دے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعہ جمالِ حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہوا کبھی ہلکا۔ کبھی پُر خوف رہا، کبھی دلاویز۔ مگر اُترا کبھی نہیں۔

آہ ازاں حوصلۂ تنگ وازاں حُسنِ بلند
کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست

جمالِ حقیقت بے نقاب ہے۔ مگر ہماری نگاہوں میں یارائے دید نہیں۔ ہم اپنی نگاہوں پر نقاب ڈال کر اُسے دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس کے چہرے پر نقاب پڑ گیا۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اُسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آ سکے وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے۔ جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حُسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لئے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ ان ربک لبالمرصاد[1] (۸۹: ۱۴) اور و اذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب

[1] یقیناً تمہارا پروردگار تمہیں گھات لگائے تاک رہا ہے۔

دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[1] (۲: ۱۸۲)

در پردہ و برہمہ کس پردہ می دری　　　با ہر کسی و با تو کسے را وصال نیست

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصور ایک فلسفیانہ تخیل ضرور پیدا کر دے گا لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی، وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے کمال درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچالے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے، مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا حسن و خوبی کی ان ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں، متصف ہے، وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے، اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں: بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ (۵: ۶۴) اس کے تحت حکومت و کبریائی کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲: ۲۵۵) لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آسکتی۔ وہ عدیم المثال ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲: ۱۱) تمہاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶: ۱۰۳) تم اس کے لئے اپنے تخیل سے مثالیں نہ گھڑو: فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶: ۷۴) پس ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اس کا دیکھنا، سننا، جاننا ویسا نہیں ہوسکتا، جس طرح کے دیکھنے، سننے، اور جاننے کا ہم تصور کرسکتے ہیں، اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطہ کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہوسکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن کے تصور الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے۔ اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا، اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کرسکے گا۔ یہاں ایک طرف بام حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں۔ دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطراب طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہ تصور تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔

نہ بہ اندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست

ایک طرف راہ کی اتنی دشواریاں۔ دوسری طرف طلب کی اتنی سہل اندیشیاں! ولنعم ما قیل۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے　　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں

---

[1] اور جب میرا بندہ تجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اس سے کہہ دے کہ میں اس سے دور کب ہوں؟ میں تو بالکل اس کے پاس ہوں۔

دور نکل جاتے ہیں، تو تشبیہ اور تجسم میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہ ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تنزیہہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات، اس کی دلآویز صفتوں کا مرقع کھینچے گا۔ تنزیہہ تشبیہ کی پرچھائیں بچاتی رہیں گی۔ ایک ہاتھ کا حُسنِ مطلق کو صورتِ صفات میں جلوہ آرا کر دے گا۔ دوسرے کا ہاتھ اسے اتنی بلندی پر تھامے رہیگا کہ تشبیہ کا گرد و غبار اُسے چھُونے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

پر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ! جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

اوپانی شد کے مصنفوں کا نفی صفات میں غلو معلوم ہے، لیکن مسلمانوں میں جب علمِ کلام کے مختلف مذاہب و آرا پیدا ہوئے، تو ان کی نظری کاوشیں اس میدان میں اُن سے بھی آگے نکل گئیں، اور صفاتِ باری کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا۔ جہمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے۔ معتزلہ نے انکار نہیں کیا لیکن ان کا رُخ رہا اسی طرف۔ امام ابوالحسن اشعری نے گو خود معتدل راہ اختیار کی تھی (جیسا کہ کتاب الابانہ سے ظاہر ہے)، لیکن ان کے پیرؤں کی کاوشیں تاویل صفات میں دور تک چلی گئیں اور بحث و نزاع سے غلو کا رنگ پیدا ہو گیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی معاملہ کی گتھی نہ سلجھا سکا۔ اگر گتھی سلجھی تو اسی طریقہ سے سلجھی جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ امام جوینی یہ اقرار کرتے ہوئے دنیا سے گئے کہ "ھا انا ذا اموت علیٰ عقیدۃ امی" (میری ماں نے جو عقیدہ سکھلایا تھا اس پر دنیا سے جا رہا ہوں)

اشاعرہ میں امام فخر الدین رازی سب سے زیادہ ان کاوشوں میں سرگرم رہے ہیں، لیکن بالآخر اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں انہیں اقرار کرنا پڑا تھا کہ:-

لقد تاملت الطرق الکلامیہ، والمناھج الفلسفیہ، فما رأیتھا تشفی علیلا ولا تروی غلیلا، ورأیت اقرب الطرق طریق القرآن اقرأ فی الاثبات "الرحمٰن علی العرش استوی" وفی النفی "لیس کمثلہ شیء" ومن جرب مثل تجربتی، عرف مثل معرفتی (نقلہ ملا علی القاری فی شرح الفقہ الاکبر)

میں نے علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا، لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار دل کے لئے شفا ہے، نہ کسی پیاسے کے لئے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تر راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔ اثباتِ صفات میں پڑھو "الرحمٰن علی العرش استوی" اور نفی تشبیہ میں پڑھو "لیس کمثلہ شیء" یعنی اثبات اور نفی، دونوں کا دامن تھامے رہو۔ اور جس کسی کو میری طرح اس معاملہ کے تجربے کا موقع ملا ہوگا، اسے میری طرح یہ حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی۔"

یہی وجہ ہے کہ اصحابِ حدیث اور سلفیہ نے اس باب میں تفویض[٥] کا مسلک اختیار کیا تھا۔ اور تاویل صفات میں کاوشیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور اسی پر انہوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطیل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و اشاعرہ کی تاویلوں میں بھی تعطل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اُن پر تجسّم اور تشبیہ کا الزام لگایا، لیکن وہ کہتے تھے کہ تمہارے تعطل سے تو ہمارا نام نہاد تشبیہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں عقیدہ کے لئے ایک تصوّر تو باقی رہ جاتا ہے۔ تمہارے سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ متاخرین اصحابِ حدیث میں امام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد امام ابنِ قیّم نے اس مسئلہ کی گہرائیوں کو خوب سمجھا، اور اسی لئے

[٥] تفویض کے مسلک سے مقصود یہ ہے کہ جو حقائق ہمارے دائرہ علم و ادراک سے باہر ہیں ان میں رد و کد اور باریک بینی نہ کرنا اور اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کر لینا۔

سلف کے مسلک سے ادھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کیا۔

آریائی اور سامی نقطۂ خیال کا اختلاف

آریائی اور سامی تعلیموں کے نقطۂ خیال کا اختلاف ہم اس معاملہ میں پوری طرح دیکھ لے سکتے ہیں۔ آریائی حکمت نے فطرتِ انسانی کی جس صورت پرستی کے تقاضے کا جواب مورتی پوجا کا دروازہ کھول کر دیا، قرآن نے اسے صرف صفات کی صورت آرائی سے پورا کر دیا اور پھر اس سے نیچے اُترنے کی تمام راہیں بند کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام مفاسد کے کھلنے کے دروازے بند ہو گئے جو بُت پرستی کی غیر عقلی زندگی سے پیدا ہو سکتے تھے اور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

محکمات اور متشابہات

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک کو "محکمات" سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری کو "متشابھات" سے "محکمات" سے وہ باتیں مقصود ہیں جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ اور ان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس لئے ایک سے زیادہ معانی کا ان میں احتمال نہیں "متشابہات" وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رُک جائے۔ اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے:- هُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ج وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ، كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (۳)

صفاتِ الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں، یہاں بجز تفویض کے چارۂ کار نہیں، پس وہ تمام فلسفیانہ کاوشیں جو ہمارے متکلموں نے کی ہیں، فی الحقیقت قرآن کے معیارِ تعلیم کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔

اوپانی شد مرتبۂ اطلاق اور مرتبۂ تشخص

اس موقعے پر یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہئے کہ ویدانت سوتر اور اس کے سب سے بڑے شنکر اچار جیا نے نفی صفات پر جتنا زور دیا ہے، وہ حقیقت کے اس مرتبۂ اطلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ جسے وہ "برہمن" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ذاتِ مطلق سے۔ لیکن اس سے انہیں بھی انکار نہیں کہ مرتبۂ اطلاق کے نیچے ایک اور مرتبہ بھی ہے۔ جہاں تمام صفاتِ ایجابی کی نقش آرائی ظہور میں آ جاتی ہے، اور انسان کے عابدانہ تصورات کا معبود وہی ذات متصف ہوتی ہے۔

اوپانی شد کے نزدیک ذاتِ مطلق "نیرو پادھیک ست" اور "نرگن" ہے۔ یعنی تمام مظاہرات سے منزہ اور عدیم التوصیف ہے۔ اگر کوئی ایجابی صفت اس کی نسبت سے کہی بھی جا سکتی ہے تو وہ اسی سلب کا ایجاب ہے۔ یعنی وہ "نرگنو گُنی" ہے۔ عدیم الوصفی صفت سے متصف۔ "ہم اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم جو کچھ کہیں گے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لا محدود کو محدود بنا دیں گے۔ اگر محدود لا محدود کا تصور کر سکتا ہے تو پھر یا تو محدود کو لا محدود ماننا پڑے گا۔ یا لا محدود کو محدود بن جانا پڑے گا" (شنکر ابھاشیا برہم سوتر۔ باب ۳) "ہم کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو الفاظ بولتے ہیں۔ وہ یا تو اس چیز کا تعلق کسی خاص نوع سے ظاہر کرتے ہیں۔

یا اُس کے فعلی خواص بتلاتے ہیں۔ یا اس کی قسم کی خبر دیتے ہیں، یا کسی اور اضافی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن برہمن کے لئے کوئی نوع نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ اس کی کوئی قسم نہیں۔ اُس کے فعلی خواص بتلائے نہیں جاسکتے۔ اس کے لئے کوئی اضافت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی مشابہت نہیں، اور چونکہ مشابہت نہیں اس لئے اس کی عدم مشابہت اور غیریت بھی انسانی تصور میں نہیں لائی جاسکتی۔ مشابہت کی طرح ہماری نفی مشابہت بھی اضافی رشتے رکھتی ہے۔" (ایضاً باب اوّل و ثانی)

غرضیکہ حقیقت اپنے مرتبۂ اطلاق میں ناممکن التعریف ہے، اور منطقی ماورائیت سے بھی ماوراء ہے۔ اسی لئے ویدانت سوتر نے بنیادی طور پر ہستی کے دو دائرے ٹھہرا دیے۔ ایک کو ممکن التصور کہا ہے۔ دوسرے کو ناممکن التصور۔ ممکن التصور دائرہ پرکرتی، عناصر، ذہن، تعقل، اور خودی کا ہے۔ ناممکن التصور دائرہ برہمن (ذات مطلق) کا۔ یہی مذہب اسکندریہ کے افلاطونیۂ جدیدہ کا بھی تھا، اور حکماء اسلام اور صوفیاء نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ صوفیاء مرتبہ اطلاق کو مرتبہ "احدیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں "احدیت" ناممکن التصور، ناممکن التعبیر، اور تمام منطقی ماورائیوں سے بھی وراء الوراء ہے۔

بنامِ آں کہ آں نامے نہ دارد
بہ ہر نامے کہ خوانی سر برآرد

لیکن پھر مرتبۂ اطلاق ایک ایسے مرتبہ میں نزول کرتا ہے جس میں تمام ایجابی صفات کی صورت آرائی کا تشخص نمودار ہو جاتا ہے۔ اوپانی شد نے اسے "ایشور" سے اور صوفیا نے "واحدیت" تعبیر کیا ہے۔ ویدانت سوتر کے شارحوں میں شنکر نے سب سے زیادہ اوپانی شد کے نفی صفات کے مسلک کو قائم رکھنا چاہا ہے اور اس باب میں بڑی کاوش کی۔ تاہم اسے بھی "سگُن برہمن" یعنی ذات متشخص و متصف کے مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑا، اور گو اس مرتبہ کے عرفان کو وہ "اپرم" یعنی فرو تر مرتبہ کا عرفان قرار دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی تسلیم کرتا ہے کہ ایک معبود ہستی کا تصوّر بغیر اس کے ممکن نہیں۔ اور انسانی ذہن و ادراک کے لئے زیادہ سے زیادہ بلند پروازی جو یہاں ہوسکتی ہے، وہ یہی ہے۔[1]

(۲) صفاتِ رحمت و جمال

ثانیاً تنزیہہ کی طرح صفاتِ رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصوّر پر نظر ڈالی جائے، تو اس کی شانِ تکمیل نمایاں ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت یہودی تصوّر میں قہر و غضب کا عنصر غالب تھا، مجوسی تصور نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنالی تھیں، مسیحی تصور نے رحم و محبت پر زور دیا تھا۔ عدالت نمایاں نہیں ہوئی۔ گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے، یا تو قہر و غضب کا عنصر غالب تھا، یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تھی، تو اس طرح آئی تھی، کہ عدالت کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایسا کامل تصور پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رہی، دوسری طرف جزاء عمل کا سررشتہ بھی ہاتھ سے نہیں دیا، کیونکہ جزاء کا اعتقاد قہر و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ عدالت کی بنا پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفاتِ الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے۔

[1] شنکر بھاشیا ۱:۱:۲ اور چندوگیا اوپانی شد قسم ۸

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

(۱۷ : ۱۱۰)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو، تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔ جس صفت سے بھی پکارو، اس کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔

یعنی وہ خدا کی تمام صفتوں کو "اسماء حسنیٰ" قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت نہیں جو حسن و خوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انہیں جا بجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو بظاہر قہر و جلال کی صفتیں ہیں۔ مثلاً جبّار، قہّار لیکن قرآن کہتا ہے، وہ بھی "اسماء حسنیٰ" ہیں۔ کیونکہ ان میں قدرت و عدالت حسن و خوبی ہے۔ خونخواری و خوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال کا بھی ذکر کیا ہے، اور پھر متصلاً ان سب کو "اسماء حسنیٰ" قرار دیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ

(۵۹ : ۲۴)

وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ الملک ہے۔ القدوس ہے۔ السلام ہے۔ المہیمن ہے۔ العزیز، الجبّار ہے۔ المتکبر ہے اور اس ساجھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اس معبودیت میں بنا رکھے ہیں۔ وہ الخالق ہے، الباری ہے، المصوّر ہے (غرضیکہ اس کے لئے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں) آسمان و زمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں، سب اس کی پاکی و عظمت کی شہادت دے رہی ہیں اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ و توانائی بھی رکھنے والی ہیں۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے:۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ [1]

(۷ : ۱۸۰)

اور اللہ کے لئے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔ سو چاہیئے کہ ان صفتوں سے اُسے پکارو۔ اور جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

چنانچہ اسی لئے سورۂ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں: ربوبیت، رحمت اور عدالت۔ اور قہر و غضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہ دی گئی۔

(۳) اشراکی تصوّرات کا کلی انسداد

ثالثاً، جہاں تک توحید و اشراک کا تعلق ہے، قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے۔ کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔

---

[1] اس آیت میں "الحاد فی الاسماء" سے مقصود کیا ہے؟ "الحاد" لحد سے ہے۔ "لحد" کے معنی میلان عن الاوسط کے ہیں۔ یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ اس لئے ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ لحد کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ انسانی افعال کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی راہ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں کیونکہ وسط حق ہے، اور جو اس سے منحرف ہوا، باطل ہے۔ "الحد فلان" ای مال عن الحق۔ پس یہاں الحاد فی الاسماء کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہ حق ہے، اس سے منحرف ہو جانا۔ امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں کی ہے "ان یوصف بما لا یصح وصفه به، وان یتاول اوصافه علی ما لا یلیق به" (مفردات ۴۶۴) یعنی خدا کے لئے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اس کا وصف نہیں ہونا چاہئے یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اُس کی شان کے لائق نہیں۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے، تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو۔ کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی دوسری ہستی اس کے صفات میں شریک وسہیم مان لی جائے قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا، لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں۔ اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لئے ٹھہرادی گئی ہیں، ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات، توحید فی الذات ہے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوامِ عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی، اس لئے مذاہب نے تمام زور توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، باوجودیکہ تمام مذاہبِ قبل از قرآن میں عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی نمودار ہوتی رہی، اور رہنمایانِ مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔ ہندوستان میں تو غالباً اول روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگزیر ہے، اور اس لئے توحید کا مقام صرف خواص کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ ایلمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہیں رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔ فیثاغورس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کے نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلّم و رہنما کی شخصیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی، جب تک معلّم و رہنما کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حدبندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا۔ کبھی شریک وسہیم ٹھہرا دیا، اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کی ہو۔ لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی آخری وصیت جو ہم تک پہنچی ہے، یہ ہے "دیکھو ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو، نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی"[1] لیکن اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا، وہ دنیا کے سامنے ہے۔ نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کئے گئے۔ بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا۔ کہ اس کے مجسموں سے زمین کا گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے بھی اتنے مجسمے نہیں نہیں بنائے گئے، جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتا سر توحید کی تعلیم تھی، لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ الوہیتِ مسیح کا عقیدہ نشوونما پا چکا تھا۔

[1] آرلی بودھ ازم ۱۲

توحید فی الصفات

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اُس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی بھی راہیں بند کر دیں، اور یہی اس باب میں یہ خصوصیت ہے، وہ کہتا ہے، ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا، تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے، یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری کو بھی شریک کر لیا، تو گویا تم نے اُسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے، دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال، وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا، تم نے اُسے خدا کا ند یعنی شریک ٹھہرا لیا، اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ط کی تلقین کی گئی۔ اس میں اوّل تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے۔ یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں" اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقامِ نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقامِ نبوت کی حد بندی کا تھا۔ یعنی معلّم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا۔ تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سدِ باب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبرِ اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے، محتاجِ بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی "میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کا بندہ اور اُس کا رسول ہے"۔ اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اُسی طرح پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا اعتقادِ اسلام کی اصل و اساس بنجائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیّل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبرِ اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے!

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، پیغمبرِ اسلام (صلعم) کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے، لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا۔

مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔

(بخاری)

جو کوئی تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اُسے معلوم ہونا چاہئیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے۔ اس کے لئے موت نہیں۔

(۴) عوام اور خواص دونوں کیلئے ایک تصور

رابعاً، قرآن سے پہلے علوم و فنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا، اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے۔ اور خواص کے لئے ہے۔ ایک تصور مجازی ہے اور عوام کے لئے ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں خدا کی پرستش کے تین درجے قرار دئیے گئے۔ عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش؛ خواص کے لئے براہ راست خدا کی پرستش۔ اخص الخواص کے لئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفۂ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے۔ کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اُس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی۔ اور سب کے لئے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کر دیا۔ وہ حکماء و عرفاء سے لے کر جہال و عوام تک، سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے، اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اُس کا تصور جس طرح ایک حکیم و عارف کے لئے سرمایۂ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لئے سرمایۂ تسکین!

اس سلسلہ میں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ ہندوستان میں خواص و عوام کے خدا پرستانہ تصوروں میں جو فرق مراتب ملحوظ رکھا گیا، وہ معاملہ کو اس رنگ میں نمایاں کرتا ہے۔ کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتداء سے فکر و عمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے۔ یعنی کسی دائرۂ فکر کو بھی اتنا تنگ اور بے لچک نہیں رکھا گیا کہ کسی دوسرے دائرہ کی اس میں گنجائش ہی نہ نکل سکے۔ یہاں خواص توحید کی راہ پر گامزن ہوئے لیکن عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش اور مورتیوں کی معبودیت کی راہیں بھی کھلی چھوڑ دی گئیں۔ گویا ہر عقیدے کو جگہ دی گئی، ہر عمل کے لئے گنجائش نکالی گئی، اور ہر طور طریقہ کو آزادانہ نشوونما کا موقع مل گیا۔ مذہبی اختلافات جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ و جدال کا ذریعہ رہا ہے، یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنا۔ اور ہمیشہ متعارض اصول باہم دگر ٹکرانے کی جگہ ایک دوسرے کے لئے جگہیں نکالتے رہے۔ تخالف کی حالت میں تفاہم اور تعارض کی حالت میں تطابق، گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی عام خصوصیت تھی۔ ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصل حقیقت اشراک اور بت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے، تاہم یہ جاننے پر بھی وہ بت پرستی کا منکر و مخالف نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پس ماندگان راہ کے لئے یہ بھی ایک ابتدائی منزل ہوئی، اور پھر کوئی راہ اختیار کرے، مگر مقصود اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے۔

خواہ از طریق میکدہ خواہ از رہ حرم :: از ہر جہت کہ شاد شوی فتح باب گیر

چنانچہ چند سال ہوئے، پروفیسر سی۔ ای۔ ایم جوڈ (JOAD) نے ہندوستان کے تاریخی خصائص پر نظر ڈالتے ہوئے اس خصوصیت کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی تھی، اور اس سے پہلے دوسرے اہل قلم بھی اس پہلو پر زور دے چکے ہیں۔

ہمیں چاہیئے، معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

بلاشبہ فکر وعمل کی اس رواداری سوچ کا جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر اُبھرتی رہی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے۔ لیکن معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ زندگی کے حقائق کے تقاضوں کا یہاں کچھ عجیب حال ہے۔ یہاں ہم کسی ایک گوشے ہی کے ہو کر نہیں رہ جا سکتے۔ دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی پڑتی ہے۔ اور فکر وعمل کی ہر راہ اتنی دور تک چلی گئی ہے کہ کہیں نہ کہیں جاکر حد بندی کی لکیریں کھینچنی پڑتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام متزلزل ہو جائیں، اور اخلاقی قدر کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے، لیکن ساتھ ہی عقیدے کی مضبوطی رائے کی پختگی، اور فکر کی استقامت کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہاں کوئی نہ کوئی حد بندی کا خط ضرور ہونا چاہیئے۔ جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھے، اخلاق کے تمام احکام انہیں حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں۔ جونہی یہ ہلنے لگتے ہیں، اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے۔ عفو و درگزر بڑی ہی حسن و خوبی کی بات ہے۔ لیکن یہی عفو و درگزر جب اپنی حد بندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو عفو و درگزر نہیں رہتا، اسے بے دلی اور بے ہمتی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ شجاعت انسانی سیرت کا بڑا وصف ہے، لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گزر جائے گا، تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جائے گا، بلکہ صورت بھی بدل جائے گی۔ اب اُسے دیکھیئے تو وہ شجاعت نہیں ہے۔ قہر و غضب اور ظلم و تشدد ہو گیا ہے۔

دو حالتیں ہیں، اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ اور ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اب اس کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے؟ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل رہیں؟ دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجے تک پہنچے ہیں۔ اُسی طرح ایک دوسرا شخص بھی ایک دوسرے نتیجے تک پہنچا ہے، اُسی طرح ایک شخص بھی ایک دوسرے نتیجے تک پہنچ گیا ہے، اور یہاں فکر وعمل کی ایک ہی راہ سب سے آگے نہیں کھلتی۔ اب ہمارا طرزِ عمل اس شخص کی نسبت کیا ہونا چاہیئے؟ ہماری طرح اُسے بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری کا صحیح محل دوسری حالت ہے پہلی نہیں ہے۔ اگر پہلی حالت میں وہ آئے گی، تو یہ رواداری نہ ہوگی۔ اعتقاد کی کمزوری اور یقین کا فقدان ہوگا۔

رواداری یہ ہے کہ اپنے حق اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسرے حق اعتقاد و عمل کا بھی اعتراف کیجیئے، اور اگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے۔ جب بھی اُس کے اس حق سے انکار نہ کیجیئے کہ وہ اپنی غلط راہ پر بھی چل سکتا ہے، لیکن اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیئے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کر سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے، تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی، استقامتِ فکر کی نفی ہو گئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، اور ہماری زندگی ہی سرتا سر مفاہمت ہے۔ لیکن ہر راہ کی طرح یہاں بھی حد بندی کی کوئی لکیر کھینچنی پڑے گی، اور جس حد پر بھی جاکر لکیر کھینچی گئی، معاً عقیدہ پیدا ہو گیا۔ اب جب تک عقیدہ کی تبدیلی کی کوئی روشنی سامنے نہیں آتی۔ آپ مجبور ہیں کہ اُس پر جمے رہیں اور اس کاٹ چھانٹ نہ کریں۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں گے۔ لیکن اپنے عقیدہ کو بھی کمزوری کے حوالہ نہیں ہونے دیں گے۔

کتنی ہی مصیبتیں ہیں جو اعتقاد اور عمل کے تمام گوشوں میں اسی دروازہ سے آئیں کہ ان دو مختلف حالتوں کا امتیازی خط اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دئیے گئے اور دوسروں کے اعتقاد۔ عمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ اگر رواداری آئی تو اس بے اعتدالی کے ساتھ آئی کہ استقامت فکر و رائے کے لئے کوئی جگہ نہ رہی۔ ہر عقیدہ لچک گیا۔ ہر یقین ہلنے لگا۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں ان مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں میں ملتی ہیں۔ جن کی خونچکاں داستانوں سے تاریخ کے اوراق رنگین ہو چکے ہیں۔ دوسری بے اعتدالی کے نتائج کی مثال ہمیں ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم و جہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی، اور علم و عقل اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دماغ کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ اس کی فکری ترقیوں کا تمام حسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد و غبار میں چھپ گیا۔

زمانۂ حال کے مؤرخوں نے اس صورتِ حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے زمانے کا ایک قابل ہندو مصنف اس عہد کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جب آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے، تسلیم کرتا ہے کہ "ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورتِ حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لے کر اونچے سے اونچے درجہ کے تہہ رس غور و خوض تک، ہر درجہ اور ہر دائرۂ فکر کے خیالات یہاں باہم دگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے، آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل، خود رو، اور روادار تھا۔ وہ جب کبھی کسی نئے مؤثر سے دوچار ہوا، تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا رہا۔ اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسار طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لئے تیار نہیں ہوا۔ کہ نچلے درجہ کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لٹھ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی مجنون کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش اس کے طور طریقے پر تسکین قلب مہیا کر دیتی ہے، تو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ بھی سچائی کی ایک راہ ہے۔ مکمل سچائی پر کوئی بہ یک دفعہ قابض نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف بہ تدریج اور بہ تفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو بھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمتوں کی یہ راہ اختیار کر لی، لیکن وہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ نارواداری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے؛ اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم (GRESHAM) قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا رہتا ہے۔[1] جب آریائی اور غیر آریائی مذہب باہم دگر ملے۔ ایک شائستہ، دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا، دوسرا نکما، تو غیر شائستہ اور نکمے اجزا میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھے اجزاء کو دبا کر معطل کر دئیے گئے!![2]

بہر حال قرآن کے تصور الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جائز نہیں رکھی۔ وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا۔ اس کی یہ مضبوط جگہ کسی طرح بھی ہمیں رودارانہ طرز عمل سے روکنا نہیں چاہتی۔ البتہ اعتقادی

---

[1] گریشم کے قانون سے مقصود اقتصادیات کی یہ اصل ہے کہ اگر کھرے سکوں کے ساتھ کھوٹے سکے ملا دیئے جائیں گے تو کھرے سکوں کی قیمت باقی نہیں رہے گی۔ [2] پروفیسر ایس۔ رادھا کرشنان۔ انڈین فلاسفی۔ جلد اوّل صفحہ ۱۱۹۔ طبع ثانی۔

مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔

خامساً، قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمّہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائناتِ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گی۔ پیدا کی گئی ہے، اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے۔ وہ اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ انفرادی اور ذاتی تجربہ و احوال کا معاملہ ہے۔ اس لئے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا۔ اسے اصحابِ جہد و طلب کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا، لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ج وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

(۲۹: آخری آیت)

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لئے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے، اور اللہ نیک کرداروں سے الگ کب ہے؟ وہ تو ان کے ساتھ ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟

(۲۱:۵۱)

اور ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں، زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

سادساً، اسی مقام سے وہ فرقِ مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جو اسلام نے بالکل ایک دوسری شکل و نوعیت میں عوام و خواص کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکروں نے عوام اور خواص میں الگ الگ تصور اور عقیدے تسلیم کر لئے۔ اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے کوئی امتیاز جائز نہیں رکھا۔ وہ حقیقت کا ایک ہی عقیدہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ طلب و جہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے، اور یہاں ایک ہی درجہ کی پیاس لے کر ہر طالبِ حقیقت نہیں آتا۔ عامۃ الناس بہ حیثیت جماعت کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں۔ خاص افراد بہ حیثیت فرد کے اپنی طلب و استعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں، پس اس نے جس امتیاز سے پہلی صورت میں انکار کر دیا تھا، اس سے دوسری صورت میں انکار نہیں کیا، اور مختلف مدارجِ طلب کے لئے عرفان و یقین کی مختلف راہیں کھلی چھوڑ دیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ روایت میں جو حدیثِ جبریل کے نام سے مشہور ہے نہایت جامع و مانع لفظوں میں یہ فرقِ مراتب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے: اسلام، ایمان، اور احسان۔ اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کا اقرار کرنا اور عمل کے اور اسلام کے بنیادی عقاید کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا۔ احسان یہ ہے کہ:

ان تعبد اللّٰه کانّک تراہ، وان لم تکن تراہ فانّه یراک (صحیحین)

تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پس گویا عرفانِ حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے۔ پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے۔ یہ اسلام ہے۔ یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی، وہ اس دائرہ میں آگیا۔ لیکن دائرہ میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم و یقین کے جو مقامات ہیں، وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا مرتبہ نمایاں ہوا جسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا۔ ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے

حاصل کر لیا، وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفانِ حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اسے احسان سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو بہ حیثیت گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربہ کا مقام ہے۔ جو یہاں تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربۂ کشف سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیمی اور احکامی عقائد کو اس میں دخل نہیں۔ بحث و نظر کی اس میں گنجائش نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے۔ بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا، وہ اگر کچھ بتلائے گا بھی تو یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ۔ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے، دیکھ لو۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست؟ ؞ گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب و جہد کی ہر پیاس کے لئے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کے لئے پہلا مرتبہ کافی ہے۔ خواص کے لئے دوسرا مرتبہ ضروری ہے، اور اخص الخواص کی پیاس بغیر تیسرے جام کے تسکین پانے والی نہیں۔ اس کے تصورِ الٰہی اور عقیدہ کا میخانہ ایک ہے، لیکن جام الگ الگ ہوئے۔ ہر طالب کے حصہ میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آتا ہے اور اس کی سرشاری کی کیفیتیں مہیا کر دیتا ہے۔ وللہِ درّ ما قال۔

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد، امّا
در مجلسِ او مستی ہر کس ز شرابے ست!

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کی متعدد تصریحات ہیں جنہیں اگر وحدۃ الوجودی تصور کی طرف لے جایا جائے تو بلا تکلف دور تک جا سکتی ہیں۔ مثلاً "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" اور "اینما تولّوا فثم وجہ اللہ" اور "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" اور "کل یوم ھو فی شان" یا تمام اس طرح کی تصریحات جن میں تمام موجودات کا بالآخر اللہ کی طرف لوٹنا بیان کیا گیا ہے۔ توحیدِ وجودی کے قائل ان تمام آیات سے مسئلہ وحدۃ الوجود پر استدلال کرتے ہیں، اور شاہ ولی اللہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنا چاہتا ہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں"۔ لیکن صاف بات جو اس بارے میں معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیئے، اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے جو صدرِ اوّل کے مخاطبوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت کے کشف و عرفان کا وہ مقام جو عرفاء طریق کو پیش آتا ہے۔ تو وہ کسی طرح بھی قرآن کے تصورِ الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ اس کا تصور ایک جامع تصور ہے، اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش موجود ہے۔ جو افرادِ خاصّہ مقامِ احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں، وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہٰی مرتبہ جو فکرِ انسانی کے دسترس میں ہے، انہیں حاصل ہو جاتا ہے۔ ومن لم یذق، لم یدر،

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست
تو زبان فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست

سابعاً، جس ترتیب کے ساتھ سورۂ فاتحہ میں یہ تینوں صفتیں بیان کی گئی ہیں، در اصل فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اسی ترتیب سے پیش آتی

ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا۔ کیونکہ کائنات ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے، اور ہر وجود کو سب سے زیادہ اسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے بعد رحمت کا ذکر کیا گیا، اس کی حقیقت بمقابلۂ ربوبیت کے مطالعہ و تفکّر کی محتاج تھی، اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے۔ تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ پھر رحمت کے بعد عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی، کیونکہ یہ سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات کی منزل سے جب قدم آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، یہاں عدالت کی نمود بھی ہر جگہ موجود ہے، اور اس لئے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضاء یہی ہے۔

---

(۶)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

ہدایت

ہدایت کے معنی رہنمائی کرنے، راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ اجمالاً اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں، ہدایت کے مختلف مراتب و اقسام پر نظر ڈالیں۔ جن کا قرآن حکیم نے ذکر کیا ہے، اور جن میں سے ایک خاص مرتبہ، وحی و نبوت کی ہدایت کا ہے۔

تکوینِ وجود کے مراتبِ اربعہ

تم ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی ربوبیت نے جس طرح مخلوقات کو اُن کے مناسب حال جسم و قویٰ دیئے ہیں۔ اسی طرح اُن کی ہدایت کا فطری سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جو ہر وجود کو زندگی و معیشت کی راہ پر لگاتی اور ضروریاتِ زندگی کی جستجو میں رہنما ہوتی ہے۔ اگر فطرت کی یہ ہدایت موجود نہ ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی زندگی و بقا کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے، ہر وجود کے بننے اور درجۂ تکمیل تک پہنچنے کے مختلف مراتب ہیں۔ اور اُن میں آخری مرتبہ ہدایت کا مرتبہ ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں بالترتیب چار مرتبوں کا ذکر کیا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی لا وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (۸۷: ۲)

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اُسے درست کیا، پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہِ عمل، کھول دی۔

یعنی تکوین وجود کے چار مرتبے ہوئے: تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت۔

تخلیق کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ بات کہ کائناتِ خلقت اور اس کے ہر وجود کا مواد عدم سے وجود میں آگیا، تخلیق ہے۔

تسویہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو جس طرح ہونا چاہیئے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح درست اور آراستہ کر دینا۔

تقدیر کے معنی اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں۔ اور اس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

ہدایت سے مقصود یہ ہے کہ ہر وجود پر اُس کی زندگی و معیشت کی راہ کھول دی جائے، اور اس کی تشریح بھی ربوبیت کے مبحث میں گزر چکی ہے۔

مثلاً مخلوقات میں ایک خاص قسم پسند کی ہے۔

(۱) یہ بات کہ ان کا مادۂ خلقت ظہور میں آگیا، تخلیق ہے۔

(۲) یہ بات کہ ان کے تمام ظاہری و باطنی قویٰ اس طرح بنا دیئے گئے کہ ٹھیک ٹھیک قوام و اعتدال کی حالت پیدا ہو گئی، تسویہ ہے

(۳) یہ بات کہ ان کے ظاہری و باطنی قویٰ کے اعمال کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا گیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتے، تقدیر ہے۔ مثلاً یہ کہ ہوا میں اُڑیں گے، مچھلیوں کی طرح پانی میں تیریں گے نہیں۔

(۴) یہ بات کہ اُن کے اندر وجدان و حواس کی روشنی پیدا ہو گئی جو انہیں زندگی و بقا کی راہیں دکھاتی، اور سامانِ حیات کے طلب و حصول میں رہنمائی کرتی ہے، ہدایت ہے۔

قرآن کہتا ہے، خدا کی ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ جس طرح اُس نے ہر وجود کو اس کا جامۂ ہستی عطا فرمایا، اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کر دے، اور اس کے اعمال کے لئے ایک مناسبِ حال اندازہ ٹھہرا دیا، اُسی طرح اس کی ہدایت کا بھی سروسامان کر دیتا۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، اور ان کی قوم کا جو مکالمہ جا بجا نقل کیا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم اپنے عقیدہ کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ (۴۳: ۲۶-۲۷)

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا: تم جن (دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہو، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا اگر رشتہ ہے تو اس ذات سے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی میری رہنمائی کرے گی۔

اَلَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ یعنی جس خالق نے مجھے جسم و وجود عطا فرمایا ہے، ضروری ہے کہ اس نے میری ہدایت کا بھی سامان کر دیا ہو۔ سورۂ شعراء میں یہی بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (۲۶: ۸۰)

جس پروردگار نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی میری ہدایت کریگا اور پھر وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا بخشتا ہے۔

یعنی جس پروردگار کی پروردگاری نے میری تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان کر دیا ہے، جو مجھے بھوک کے لئے غذا، پیاس کے لئے پانی اور بیماری میں شفا عطا فرماتا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اس نے مجھے پیدا تو کر دیا ہو، لیکن میری ہدایت کا سامان نہ کیا ہو؟ اگر اس نے مجھے پیدا کیا ہے، تو یقیناً وہی ہے جو طلب و سعی میں میری رہنمائی بھی کرے، سورۂ صافات میں یہی مطلب ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۳۷: ۹۱)

میں (ہر طرف سے کٹ کر) اپنے پروردگار کا رخ کرتا ہوں۔ وہ میری ہدایت کرے گا۔

"ربی" کے لفظ پر غور کرو، وہ "میرا رب" ہے اور جب وہ "رب" ہے تو ضروری ہے کہ وہی مجھ پر راہِ عمل بھی کھول دے۔

ہدایت کے ابتدائی تین مرتبے

پھر ہدایت کے بھی مختلف مراتب ہیں جو ہم حیوانات میں محسوس کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مرتبہ وجدان کی ہدایت کا ہے۔ وجدان طبیعتِ حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لئے رونے لگتا ہے۔ اور پھر بغیر اس کے خارج کی کوئی رہنمائی اُسے ملی ہو، ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی چوسنے

چوستا اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے، اور وہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سننے چکھنے، چھونے، اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہے، اور انہی کے ذریعہ ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔

ہدایتِ فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان، سب کے لئے ہیں، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیسرا مرتبۂ ہدایت بھی موجود ہے، اور وہ عقل کی ہدایت ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے۔ جس نے انسان کے آگے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے، اور اُسے کائناتِ ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل و خلاصہ بنا دیا ہے۔

وجدان کی ہدایت اُس میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے، حواس اس کے لئے معلومات بہم پہنچاتے ہیں، اور عقل، نتائج و احکام مرتب کرتی ہے، حیوانات کو اس آخری مرتبہ کی ضرورت نہ تھی، اس لئے اُن کا قدم وجدان اور حواس سے آگے نہیں بڑھا، لیکن انسان میں یہ تینوں مرتبے جمع ہو گئے۔

جوہرِ عقل کیا ہے؟ دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے۔ جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم، اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے، اُسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک، جو نباتات میں مخفی، اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا۔ انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجۂ کمال تک پہنچ گیا، اور جوہرِ عقل کے نام سے پکارا گیا۔

ہر مرتبۂ ہدایت ایک خاص حد سے آگے رہنمائی نہیں کر سکتا

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے ان تینوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اگر اُس مرتبہ سے ایک دوسرا بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا، تو ہماری معنوی قوتیں اُس حد تک ترقی نہ کر سکتیں، جس حد تک فطرت کی رہنمائی ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوباتِ زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے، اُس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام مرتبۂ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی رہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ کان سنتا ہے، زبان چکھتی ہے۔ ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے۔ اور اس طرح اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔

لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکتی آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اُسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں۔ اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو، یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے۔ ہمیں استنباط و استنتاج کی ضرورت ہے، احکام کی ضرورت ہے، کلیات کی ضرورت ہے۔ اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے، وہ ان تمام مدرکات کو جو حواس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، ترتیب دیتی ہے، اور ان سے احکام و کلیات کا استنباط کرتی ہے،

ہر مرتبہ ہدایت اپنی تصحیح و نگرانی میں بالاتر مرتبہ ہدایت کا محتاج ہے

علاوہ بریں جس طرح وجدان کی نگرانی کے لئے حواس و مشاعر کی ضرورت تھی، اسی طرح حواس کی تصحیح و نگرانی کے لئے عقل کی ضرورت ہوئی

حواس کا ذریعۂ ادراک نہ صرف محدود ہی ہے، بلکہ بسا اوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔ ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ ایک سیاہ نقطے سے زیادہ جسم نہیں رکھتی۔ حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتا ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا حاسۂ ذوق یقین دلاتا ہے کہ مزا کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں ایک لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں۔ لکڑی مستقیم ہوتی ہے۔ لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں، اور ہمیں ایسی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں، اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند مرتبۂ ہدایت وجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی ان درماندگیوں میں حقیقت کا سُراغ پا سکتے۔ لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے، وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرّہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اُسے ایک سُنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ شہد کا مزہ ہر حال میں میٹھا ہے، اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوا ہے، تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں بتلاتی ہے، کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں اور اس حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں، وہ خارج کی صدائیں نہیں ہوتی۔ خود ہمارے ہی دماغ کی گونج ہوتی ہے۔

ہدایت فطرت کا چوتھا مرتبہ

لیکن جس طرح وجدان کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس طرح حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی ہدایت کا کوئی مزید مرتبہ ہونا چاہیئے، کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کے دائرۂ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا ہے۔ عقل کی کارفرمائی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے، محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اُسی حد تک کام دے سکتی ہے، جس حد تک ہمارے حواسِ خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی؟ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے، اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔

علاوہ بریں جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے، عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے نہ ہر حال میں مؤثر۔ نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے، تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کے لئے ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے، لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں، اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصّے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں، اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

اچھا اگر خدا کی ربوبیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہمیں وجدان کے ساتھ حواس بھی دے، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اگر ضروری تھا کہ حواس کے ساتھ عقل بھی دے کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اعمال کی درستگی و انضباط کے لئے کافی نہیں؟ اگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس بھی دیئے تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں، اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی، تاکہ حواس کی غلطیوں میں قاضی و حاکم ہو، تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل

کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا، تاکہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہوتا؟

قرآن کہتا ہے کہ ضروری تھا، اور اسی لئے اللہ کی ربوبیت نے انسان کے لئے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جسے وہ وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے جا بجا ان مراتبِ ہدایت کا ذکر کیا ہے، اور انہیں ربوبیتِ الٰہی کی سب سے بڑی بخشش و مرحمت قرار دیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ○ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ط

(۷۶ : ۲).

ہم نے انسانوں کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا جسے (ایک کے بعد ایک، مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں، پھر اُسے ایسا بنا دیا کہ سننے والا اور دیکھنے والا وجود ہوگیا، ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی۔ اب یہ اُس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو، یا ناشکرا (یعنی یا تو خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح اور سعادت کی راہ اختیار کرے، یا ان سے کام نہ لے، اور گمراہ ہو جائے)

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ○ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ○ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾

(۹۰ : ۶)

کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں)؟ اور کیا اس نے (سعادت و شقاوت) کی دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○

(۱۶ : ۸۰)

اور اللہ نے تمہارے لئے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیے اور سوچنے کے لئے دل (یعنی عقل[1]) تاکہ تم شکر گزار ہو (یعنی خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)

ان آیات اور ان کی ہم معنی آیات حواس و مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارات کئے گئے ہیں، لیکن وہ مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے، وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (۹۲ : ۱۳)

بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں، اور یقیناً آخرت اور اور دنیا، دونوں ہمارے ہی لئے ہیں۔

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ

(۴۱ : ۱۶)

اور باقی رہی قوم ثمود، تو اُسے بھی ہم نے راہ (حق) دکھلا دی تھی، لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ پسند کیا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ط

(۲۹ : ۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی، تو ضروری ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں، اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں۔

---

[1] یاد رہے کہ عربی میں قلب اور فؤاد کے معنی محض اُس عضو ہی کے نہیں ہیں جسے اُردو میں دل کہتے ہیں، بلکہ اس کا اطلاق عقل و فکر پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں سمع و بصر وغیرہ کے ساتھ قلب اور فؤاد کہا گیا ہے اس سے مقصود عقل و فکر ہے۔

الھُدٰی

چنانچہ اس سلسلہ میں وہ اللہ کی ایک خاص ہدایت کا ذکر کرتا ہے، اور اسے "الھُدٰی" کے نام سے پکارتا ہے۔ یعنی الف لام تعریف کے ساتھ۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ (۶ : ۷۱)

(اے پیغمبر ان سے) کہدو، یقیناً اللہ کی ہدایت تو "الھُدٰی" ہے، اور ہم سب کو (اسی بات کا) حکم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ (۲ : ۱۲۰)

اور (یاد رکھو) یہودی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک کہ تم انکی ملت کی پیروی نہ کرو، اور یہی حال نصاریٰ کا ہے، (اے پیغمبر!) تم ان سے کہدو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو الھُدٰی ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ) وہ حقیقی راہ کونسی ہے؟ قرآن کہتا ہے، وحی الٰہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے، اور بلا تفریق و امتیاز، تمام نوع انسانی کے لئے ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے وجدان، حواس، اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا۔ اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقہ و امتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کے لئے ہے، اور سب کو دی گئی ہے، اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ، صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسی لئے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور متخالف ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں، اور سعادت و نجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنالی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے، انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں، ہدایت کی راہ نہیں ہو سکتیں ہدایت کی راہ تو وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے۔ اسی عالمگیر ہدایتِ وحی کو وہ "الدین" کے نام سے پکارتا ہے، یعنی نوعِ انسانی کے لئے حقیقی دین۔ اور اسی کا نام اس کی زبان میں "الاسلام" ہے۔

وحدتِ دین کی اصلِ عظیم اور قرآن حکیم

یہ اصلِ عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتا ہے، تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر اس اصل سے قطع نظر کر لی جائے، تو اس کا تمام کارخانۂ دعوت درہم برہم ہو جائے۔ لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیئے۔ کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا، اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا۔ حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے، آج قرآن کی کوئی بات بھی دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے۔ جس قدر کہ یہ اصلِ عظیم۔ اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے، اور اس کے صفحات میں جا بجا اس اصلِ عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے، اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھائے جو قرآن کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں سمجھتی کہ بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح وہ بھی ایک مذہبی گروہ بندی ہے، تو یقیناً وہ حیران ہو کر پکار اٹھے گا، یا تو اس کی نگاہیں اسے دھوکا دے رہی ہیں، یا دنیا ہمیشہ آنکھیں کھولے بغیر ہی اپنے

فیصلے صادر کر دیا کرتی ہے!

دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات

اس حقیقت کی توضیح کے لئے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی جائے کہ جہاں تک وحی و نبوت کا، یعنی دین کا تعلق ہے، قرآن کی دعوت کیا ہے، اور کس راہ کی طرف نوع انسانی کو لے جانا چاہتی ہے؟

جمعیت بشری کی ابتدائی وحدت، پھر اختلاف اور ہدایت وحی کا ظہور

اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: وہ کہتا ہے، ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا، نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی، اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کی کثرت اور ضروریاتِ معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا، اور ہر زبردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لئے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی، اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ وہ اُن تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعہ اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا "رسول" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے، اور "رسول" کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

(۱۰ : ۱۹)

اور ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (الگ الگ گروہوں میں متفرق نہ تھے) پھر ایسا ہوا کہ وہ باہم دگر مختلف ہو گئے، اور اگر اس بارے میں تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک فیصلہ نہ کر دیا ہوتا (یعنی یہ کہ انسانوں میں اختلاف ہوگا، اور مختلف راہیں لوگ اختیار کریں گے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا (یہیں دنیا میں) فیصلہ کر دیا جاتا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ط فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط

(۲ : ۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نیک عملی کے نتائج کی) بشارت دیتے اور (بد عملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے۔ نیز ان کے ساتھ الکتاب (یعنی وحی الٰہی سے لکھی جانے والی تعلیم) نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔

عموم ہدایت

یہ ہدایت کسی خاص ملک و قوم یا عہد کے لئے مخصوص نہ تھی۔ بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے تھی۔ چنانچہ ہر زمانے اور ہر ملک میں یکساں طور پر اس کا ظہور ہوا۔ قرآن کہتا ہے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسل انسانی آباد ہوئی ہو، اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ط (۳۵ : ۲۵)

اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بد عملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا (خدا کا کوئی رسول) نہ گزرا ہو۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ط (۱۳ : ۹)

(اے پیغمبر) بلاشبہ تم اس کے سوا اور کیا ہو کہ (بدعملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والے ہو! اور دنیا میں ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہوا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ج فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ط (۱۰ : ۴۸)

اور ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے پس جب رسول ظاہر ہوتا ہے، تو تمام باتوں کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کے ابتدائی عہد اور خدا کے رسول

وہ کہتا ہے، نسلِ انسانی کے ابتدائی عہدوں میں کتنے ہی پیغمبر گزرے ہیں۔ جو یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے، اور قوموں کو پیغامِ حق پہنچایا۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ ٥ (۴۳ : ۵)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کئے!

عدلِ الٰہی اور بعثتِ رسل

وہ کہتا ہے، یہ بات عدلِ الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک گروہ اپنے اعمالِ بد کے لئے جواب دہ ٹھہرایا جائے۔ حالانکہ اُس کی ہدایت کے لئے کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو،

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ٥ (۱۷ : ۱۶)

اور ہمارا قانون یہ ہے کہ، جبتک ہم ایک پیغمبر مبعوث کرکے راہِ ہدایت دکھا نہ دیں۔ اُس وقت تک (پاداشِ عمل میں) عذاب دینے والے نہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ط وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ط (۲۸ : ۵۹)

اور (یاد رکھو) تمہارے پروردگار کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی انسان کی بستیوں کو (پاداشِ عمل میں) ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان میں ایک پیغمبر مبعوث نہ کردے، اور وہ خدا کی پڑھ کر نہ سنا دے، اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں، مگر صرف اسی حالت میں کہ اُن کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کر لیا ہو،

بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا بعض کا نہیں کیا گیا

خدا ان رسولوں اور دینِ الٰہی کے داعیوں میں سے بعض کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ بعض کا نہیں کیا گیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ ط وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (۴۰ : ۷۸)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کئے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

بے شمار قومیں اور بے شمار رسول

قومِ نوح اور عاد و ثمود کے بعد کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں، اور اُن میں کتنے ہی رسول مبعوث ہو چکے ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک حال اللہ ہی کو معلوم ہے:

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ط لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ

تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں۔ کیا تم تک اُن کی خبر نہیں پہنچی؟ قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں (جن جن کی ٹھیک ٹھیک تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے)،

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ

(۱۴ : ۹)

ان سب میں ان کے پیغمبر سچائی کی روشنیوں کے ساتھ مبعوث ہوئے مگر انہوں نے جہل و سرکشی سے ان کی تعلیم انہی پر لوٹا دی اور کان دھرنے سے انکار کر دیا!

ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان اور عملِ صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی

فطرتِ الٰہی کی راہ، کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے، نہ باہم دگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی ہے، اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے، خدا کے جتنے پیغامبر پیدا ہوئے، خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی، اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانونِ سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کا قانون ہے۔ یعنی ایک پروردگارِ عالم کی پرستش کرنی، اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی، اس کے علاوہ، اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے، دینِ حقیقی کی تعلیم نہیں ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج (۱۶ : ۳۸)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا۔ (جس کی تعلیم یہ تھی) کہ اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغوا سے) اجتناب کرو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ط

اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی کے ساتھ، کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو!

سب نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم دی

وہ کہتا ہے، دنیا میں کوئی بانیٔ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے، جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لئے نہیں ہے پس ایک پروردگارِ عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ، اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ط

(۲۳ : ۵۲)

(اور (دیکھو) یہ تمہاری اُمت، فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ، اور) نافرمانی سے بچو!

وہ کہتا ہے، خدا نے تمہیں ایک ہی جامۂ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لئے اور رشتۂ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں۔ اس لئے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمہارے وطن بہت سے بن گئے ہیں۔ اس لئے اختلافِ وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں اس لئے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریبان ہو رہی ہے۔ تمہارے رنگ یکساں نہیں، اور یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں، اور یہ بھی ایک

دوسرے سے جُدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے، پھر ان کے علاوہ امیر و فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف، ضعیف و قوی، ادنیٰ و اعلیٰ، بے شمار اختلاف پیدا کر لئے گئے ہیں۔ اور سب کا منشاء یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاؤ، اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ، وہ رشتہ کون سا رشتہ ہے، جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے، اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانہ پھر از سرِ نو آباد ہو جائے؟ وہ کہتا ہے، صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے، اور خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو جا سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو، تم سب کی بندگی و نیاز کے لئے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے، تم بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتۂ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو، تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سرِ نیاز جھکا دو گے، تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلاف مٹا دے گا۔ تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسلِ انسانی تمہارا گھرانا ہے، اور تم سب ایک ہی رب العٰلمین کی عیال ہو۔

چنانچہ وہ کہتا ہے، خدا کے جتنے رسول بھی پیدا ہوئے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ "الدّین" پر یعنی بنی نوعِ انسانی کے ایک عالمگیر دین پر قائم رہو، اور اس راہ میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ!

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ
نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا
وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَ
عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا
فِيْهِ ؕ (۴۲ : ۱۳)

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی، اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدّین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو، اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ!

قرآن کی تحدّی کہ اس حقیقت کے خلاف کوئی مذہبی تعلیم اور روایت نہیں پیش کی جا سکتی ہے

اسی بنا پر وہ بطورِ ایک دلیل کے اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ اگر تعلیم کی سچائی سے انکار ہے، تو کسی مذہب کی الہامی کتاب سے بھی ثابت کر دکھاؤ کہ دینِ حقیقی کی راہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے، تم جس مذہب کی بھی حقیقی تعلیم دیکھو گے اصل و بنیاد یہی ملے گی۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ
مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ
فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ وَمَآ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ
اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝
(۲۱ : ۲۴-۲۵)

(اے پیغمبر ان سے) کہہ دو (اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے، تو) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں، اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ۔ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو) اصل یہ ہے کہ ان (منکرینِ حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امرِ حق کی خبر ہی نہیں، اور اس لئے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں۔ (اے پیغمبر! یقین کر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی

پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو"!

اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ کہتا ہے، علم و بصیرت کے کسی قول اور روایت سے تم ثابت کر دکھاؤ کہ جو کچھ میں بتلا رہا ہوں۔ یہی تمام پچھلی دعوتوں کی تعلیم نہیں رہی ہے۔

اِئْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۴۶ : ۴)

اگر تم اپنے انکار میں سچے ہو، تو ثبوت میں کوئی کتاب پیش کرو جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہو، یا کم از کم، علم و بصیرت کی کوئی پچھلی روایت ہی لا دکھاؤ جو تمہارے پاس موجود ہو!

تمام مقدس کتابوں کی باہم دگر تصدیق اور اس سے قرآن کا استدلال

اسی بنا پر، وہ تمام مذاہب عالم کی باہم دگر تصدیق کو بطور ایک دلیل کے پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے ان میں سے ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے جھٹلاتی نہیں۔ اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، تو اس سے معلوم ہوا، ان تمام تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں، اور مختلف زبانوں سے کوئی بات کہی گئی ہو، اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو۔ اور ایک مقصد پر زور دیتی ہو، تو قدرتی طور پر تمہیں ماننا پڑے گا کہ ایسی بات اصلیت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (۳ : ۲)

(اے پیغمبر!) اللہ نے تم پر کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کے لئے اس نے تورات اور انجیل کی تھی۔

وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ (۵ : ۴۶)

اور ہم نے عیسیٰ کو انجیل عطا کی۔ اس میں انسان کے لئے ہدایت اور روشنی ہے۔ اور اس سے پہلے جو تورات نازل ہو چکی تھی وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس کے بیان و موعظت کا ایک بڑا موضوع پچھلے عہدوں کی ہدایتوں اور رسالتوں کا تذکرہ ہے۔ وہ ان کی یکسانی، ہم آہنگی، اور وحدتِ تعلیم سے مذہبی صداقت کے تمام مقاصد پر استشہاد کرتا ہے۔

"الدین" اور "الشرع"

ادیان کا اختلاف

اچھا، اگر تمام نوعِ انسانی کے لئے دین ایک ہی ہے اور تمام بانیانِ مذاہب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی ہے، تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہوا؟ کیوں تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام، ایک ہی طرح کے اعمال، ایک ہی طرح کے رسوم و ظواہر نہ ہوئے؟ کسی مذہب میں عبادت کی ایک خاص شکل اختیار کی گئی ہے، کسی میں دوسری۔ کسی مذہب کے ماننے والے ایک طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ کسی مذہب کے ماننے والے دوسری طرف۔ کسی کے ہاں احکام و قوانین ایک خاص طرح کی نوعیت کے ہیں۔ کسی کے ہاں دوسری طرح کے۔

اختلاف دین میں نہیں ہوا۔ شرع و منہاج میں ہوا، اور یہ ناگزیر تھا

قرآن کہتا ہے، مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروانِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے یہ اختلاف مذہب کا اختلاف نہیں ہے، پیروانِ مذاہب کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرا اختلاف وہ ہے۔ جو فی الحقیقت مذاہب کے احکام و اعمال میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل اختیار کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل۔ تو یہ اختلاف اصل و حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔ محض فروع و ظواہر کا اختلاف ہے، اور ضروری تھا کہ ظہور میں آتا۔

وہ کہتا ہے، مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو اُن کی رُوح و حقیقت ہے۔ دوسری وہ ہے جن سے اُن کی ظاہری شکل و صورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے۔ دوسری فرع ہے۔ پہلی چیز کو وہ "دین" تعبیر کرتا ہے۔ دوسری کو "شرع" اور "نسک" سے، اور اس کے لئے "منہاج" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ "شرع" اور "منہاج" کے معنی راہ کے ہیں، اور "نسک" سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں "شرع" قانونِ مذہب کو کہنے لگے اور "نسک" عبادت کو۔ وہ کہتا ہے۔ مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف، اُن کا اصلی اختلاف ہے، وہ "دین" کا اختلاف نہیں۔ محض شرع و منہاج کا اختلاف ہے، یعنی اصل کا نہیں ہے، فرع کا ہے۔ حقیقت کا نہیں ہے، ظواہر کا ہے۔ روح کا نہیں ہے، صورت کا ہے اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔ مذہب کا مقصود انسانی جمعیت کی سعادت و اصلاح ہے، لیکن انسانی جمعیت کے احوال و ظروف ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں، اور نہ یکساں رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے کی معاشرتی اور ذہنی استعداد ایک خاص طرح کی معیشت چاہتے تھے۔ کسی دوسرے ملک کے حالات دوسری طرح کی۔ پس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد و طبیعت کے لوگوں میں ہوا، اُسی طرح کے مطابق شرع و منہاج کی صورت بھی اختیار کی گئی۔ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی، وہی اُس کے لئے موزوں تھی۔ اس لئے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے، اور یہ اختلاف اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جتنی اہمیت نوعِ بشری کے تمام معاشرتی اور طبیعی اختلافات کو دی جا سکتی ہے۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۝

(۲۲: ۶۶)

(اے پیغمبر!) ہم نے ہر گروہ کے لئے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے۔ جس پر وہ چلتا ہے، پس لوگوں کو چاہیئے، اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو۔ یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستہ پر گامزن ہو۔

تحویلِ قبلہ کا معاملہ اور قرآن کا اعلانِ حقیقت

جب تحویلِ قبلہ کا معاملہ پیش آیا۔ یعنی پیغمبر اسلام (صلعم) بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے، تو یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں پر بہت شاق گزری۔ اُن کے نزدیک مذہب کا تمام دار و مدار اسی طرح کی ظاہری اور فروعی باتوں پر تھا، اور انہی کو وہ حق و باطل کا معیار سمجھتے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے اس معاملہ کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم اس طرح کی باتوں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ نہ تو حق و باطل کا معیار ہیں، نہ مذہب کی اصل و حقیقت میں انہیں کوئی دخل ہے۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے حالات و مقتضیات کے مطابق

کوئی ایک طریقہ عبادت کا اختیار کر لیا تھا، اور اُس پر لوگ کاربند ہو گئے۔ مقصود اصلی سب کا ایک ہی ہے، اور وہ خدا پرستی اور نیک عملی ہے۔ پس جو شخص سچائی کا طلبگار ہے اُسے چاہئے کہ اصل مقصود پر نظر رکھے، اور اسی لحاظ سے ہر بات کو جانچے پرکھے، ان باتوں کو حق و باطل کا معیار نہ بنالے۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا
تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ

(۲: ۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لئے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منہ کر لیتا ہے (پس) اس معاملہ کو اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو کہ اصلی کام یہی ہے، تم کسی جگہ بھی ہو، اللہ تم کو پالیگا۔ یقیناً اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں!

قرآن کے نزدیک دین کے اعتقاد وعمل کی اصلی باتیں کیا کیا ہیں؟

پھر اسی سورت میں آگے چل کر، صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اصل دین کیا ہے، اور کن باتوں سے ایک انسان دین کی سعادت وفلاح حاصل کر سکتا ہے، وہ کہتا ہے، دین محض اس طرح کی باتوں میں نہیں دھرا ہے، کہ ایک شخص نے عبادت کے وقت پچھم کی طرف منہ کر لیا یا پورب کی طرف، اصل دین تو یہ ہے کہ دیکھا جائے، خدا پرستی اور نیک عملی کے لحاظ سے ایک انسان کا کیا حال ہے؟ پھر تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے، کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی باتیں کیا کیا ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَ
آتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ
بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَ
الصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ
الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۚ

(۲: ۱۷۷)

اور (دیکھو) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اتنا پچھم کی طرف کر لیا یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی کر لی، نیکی کی راہ تو اس کی راہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر، اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے، اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیتا ہے، اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے۔ نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول وقرار کا پکا ہوتا ہے، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے (سو یاد رکھو) ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنی دینداری میں سچے ہیں، اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

جس کتاب میں تیرہ سو برس سے یہ آیت موجود ہے، اگر دُنیا اُس کی دعوت کا مقصدِ اصلی نہیں سمجھ گئی، تو پھر کون سی بات ہے جسے دنیا سمجھ سکتی ہے؟

خدا کی حکمت اسی کی مقتضی ہوئی کہ اختلاف شرائع ظہور میں آئے

سورۂ مائدہ میں ہم دیکھتے ہیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر حضرت موسیٰ اور تورات سے شروع ہوتا ہے:۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے:۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ حضرت مسیحؑ کے بعد پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا:۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے، اور کہتا ہے:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ

(۵ : ۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے (یعنی ہر دعوت کے پیروؤں کے لئے) ایک خاص شریعت اور راہ ٹھہرا دی۔ اگر اللہ چاہتا تو (شریعتوں کا کوئی اختلاف نہ ہوتا) تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ (ہر وقت و حالت کے مطابق) تمہیں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس اس اختلاف کے پیچھے نہ پڑو، نیکی کی راہوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔

پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت بھلا دی، اور شرع کے اختلاف کو بنائے نزاع بنا لیا۔

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو۔ قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال یہ تھا کہ تمام پیروانِ مذاہب، مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے، اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا، دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں، جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں، نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ مگر روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے، اور وہی اصلی دین ہے۔ یہ اصلی دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے، اور چونکہ یہ اصلی دین ہے، اس لئے نہ تو اس میں تغیر ہوا، نہ کسی طرح کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال و رسوم فروع ہیں، اس لئے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے، اور جس قدر بھی اختلاف ہوا، انہی میں ہوا۔

پھر وہ کہتا ہے، اعمال و رسوم کے اس اختلاف کو تم اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہو؟ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک کے لئے ایک خاص طرح کا طور طریقہ ٹھہرا دیا تھا۔ جو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق مناسب تھا، اور وہ اسی پر کاربند ہو گیا۔ اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا، اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود ہی میں نہ آتا، لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا مقتضا یہی ہوا کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا اختلاف کیوں بنا لیا جائے؟ کیوں اس اختلاف کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار رہے؟ اصلی چیز جس پر تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہیئے "خیرات" ہے۔ یعنی نیکی کے کام ہیں، اور تمام

و رسوم بھی اُنہی کے لئے ہیں۔

غور کرو، اس آیت میں لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کہا۔ یعنی تم سے ہر جماعت کے لئے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھہرا دی۔ یہ نہیں کہا کہ ایک "دین" ٹھہرا دیا۔ کیونکہ دین تو سب کے لئے ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد و تنوع نہیں ہو سکتا۔ البتہ شرع و منہاج سب کے لئے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں، پس مذاہب کا اختلاف، اصل کا اختلاف نہیں ہوا۔ محض فرع کا اختلاف ہوا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے" "یا" ایک ہی قوم بن جاتے، جیساکہ آیت مندرجہ صدر میں ہے، تو ان سب سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ وہ چاہتا ہے، یہ بات لوگوں کے دلوں میں اتار دے کہ فکر و عمل کا اختلاف طبیعت بشری کا قدرتی خاصہ ہے، اور جس طرح ہر گوشے میں موجود ہے، اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی موجود ہے۔ پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار نہیں سمجھنا چاہیئے وہ کہتا ہے، جب خدا نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر انسان، ہر قوم، ہر عہد، اپنی اپنی سمجھ اپنی پسند، اور اپنا اپنا طور طریقہ رکھتا ہے، اور ممکن نہیں، کسی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی تمام انسانوں کی طبیعت ایک طرح کی ہو جائے تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ مذہبی اعمال و رسوم کی راہیں مختلف نہ ہوتیں، اور سب ایک ہی طرح کی وضع و حالت اختیار کر لیتے؟ یہاں بھی اختلاف ہونا تھا، اور اختلاف ہوا، کسی نے ایک طریقے سے اصل مقصود حاصل کرنا چاہا، کسی نے دوسرے طریقے سے، لیکن اصل مقصود، یعنی خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم، تو اس میں سب متفق رہے۔ پس جب اصل مقصود سب کا ایک ہے تو محض ظواہر و اعمال کے اختلاف سے کیوں ایک دوسرے کے مخالف و معاند ہو جائیں؟ کیوں ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلائے؟ کیوں مذہبی سچائی کسی ایک ہی نسل و گروہ کی میراث سمجھ لی جائے؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شریعتوں کے اس اختلاف ہی کے لئے نہیں، بلکہ فکر و عمل کے ہر اختلاف کے لئے رواداری اور وسعت نظر کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت کے خلاف جبر و تشدد کام میں لا رہے تھے، ان کی طرف سے بھی اُسے معذرت کرنے میں تامل نہیں۔ ایک موقعہ پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ تم جوش دعوت میں چاہتے ہو کہ ہر انسان کو راہ حقیقت دکھا دو۔ لیکن نہیں یہ بات تمہیں بھولنی چاہیئے کہ اختلاف فکر و عمل طبیعت انسانی کا قدرتی خاصہ ہے۔ تم بہ جبر کسی کے اندر ایک بات نہیں اتار دے سکتے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ط اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ط (١٠ : ٩٩)	اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو زمین میں جتنے انسان ہیں، سب ایمان لے آتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو، کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا، کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے)، پھر کیا تم چاہتے ہو، لوگوں کو مجبور کر دو کہ مومن ہو جائیں؟

وہ کہتا ہے، انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر جماعت کو اپنا ہی طور طریقہ اچھا دکھائی دیتا ہے، وہ اپنی باتوں کو دوسروں کی مخالفانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح تمہاری نظر میں سب سے بہتر راہ تمہاری ہے، ٹھیک اسی طرح دوسروں کی نظر میں سب سے بہتر راہ ان کی ہے، پس ان کے

اپنے اندر پیدا کرو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ
مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ
عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا
لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ص ثُمَّ
إِلٰى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ
بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥

(۶: ۱۰۸)

اور (دیکھو) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں، تم اُن پر سب و شتم نہ کرو۔ کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہ عمل جہل و نادانی خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں گے (یاد رکھو) ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، اور وہیں ہر گروہ پر اُس کے اعمال کی حقیقت کُھلنے والی ہے۔

"تشیع" اور "تحزّب" کی گمراہی اور تجدیدِ دعوت کی ضرورت

اچھا، جب تمام مذاہب کا اصل مقصد ایک ہی ہے، اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے، تو پھر قرآن کے ظہور کی ضرورت کیا تھی؟

وہ کہتا ہے، اس لئے، کہ اگرچہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب ان کی گم شدہ سچائی پر از سر نو جمع کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں اُس نے پیروانِ مذاہب کی تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے گنائی ہیں۔ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک سب سے بڑی گمراہی جس پر جا بجا زور دیتا ہے، وہ ہے، جسے اُس نے "تشیع" اور "تحزب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں "تشیح" اور "تحزب" کے معنی یہ ہیں کہ الگ الگ جتھے بنا لینا، اور ان میں ایسی روح کا پیدا ہو جانا جسے اردو میں گروہ پرستی کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ
كَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي
شَيْءٍ ط إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللّٰهِ
ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ٥ (۶: ۱۶

جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے، تمہیں اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُن کا معاملہ خدا کے حوالے ہے، جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں، اُس کا نتیجہ خدا انہیں بتلا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ
زُبُرًا ط كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ
فَرِحُونَ ٥ (۲۳: ۵۳)

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جُدا جُدا دین بنا لئے، ہر ٹولی کے پلّے جو کچھ پڑ گیا ہے اسی میں مگن ہے!

تشیع اور تحزب کی حقیقت

"تشیع" اور "تحزب" کی گمراہی سے کیا مقصود ہے؟ اُسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے، خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ نوعِ انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا۔ یعنی خدا کے اس قانون کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی افکار و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں، اچھے فکر و عمل کا بدلہ اچھا ہے۔ بُرے فکر و عمل کا بدلہ بُرا ہے۔ لیکن لوگوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی، اور دین و مذہب کو نسلوں، قوموں، ملکوں، اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا ایک جتھا بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ

اب انسان کی نجات و سعادت کی راہ یہ نہیں سمجھی جاتی کہ کس کا اعتقاد اور عمل کیسا ہے؟ بلکہ سارا دارو مدار اس پر آکے ٹھہر گیا ہے کہ کون کس جتھے اور گروہ بندی میں داخل ہے؟ اگر ایک آدمی کسی خاص مذہبی گروہ بندی میں داخل ہے، تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے اور دین کی سچائی اسے مل گئی۔ اگر داخل نہیں ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اس پر بند ہوگیا، اور دین کی سچائی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ گویا دین کی سچائی، آخرت کی نجات اور حق و باطل کا معیار، تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہوگئی۔ اعتقاد اور عمل کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر باوجودیکہ تمام مذاہب کا مقصود اصلی ایک ہی ہے، اور سب ایک ہی پروردگار عالم کی پرستش کرنے کے مدعی ہیں۔ لیکن ہر گروہ یقین کرتا ہے کہ دین کی سچائی صرف اسی کے حصہ میں آئی ہے۔ باقی تمام نوع اس سے محروم ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے خلاف نفرت و تعصب کی تعلیم دیتا ہے اور دنیا میں خدا پرستی اور دین داری کی راہ، سر تا سر بغض و عداوت، نفرت و توحش، اور قتل و خونریزی کی راہ بن گئی ہے!

اس بارے میں دعوت قرآنی کی تین جہات

اس سلسلہ میں قرآن نے جن جہات پر زور دیا ہے، اُن میں تین باتیں سب سے نمایاں ہیں:-

(۱) انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے، نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔

(۲) نوع انسانی کے لئے دین الٰہی ایک ہی ہے، اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے، پس یہ جو پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت اور عالمگیر حقیقت ضائع کرکے بہت سے متخالف اور متخاصم جتھے بنا لئے ہیں، یہ صریح گمراہی ہے۔

(۳) اصل دین توحید ہے۔ یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنی، اور تمام بانیانِ مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لئے گئے ہیں، اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی اور اس کا رد

چنانچہ آیات مندرجۂ صدر کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی اسی حقیقت پر زور دیا گیا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا
مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا
بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ
وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝

(۲ : ۱۰۶)

اور یہود اور نصاریٰ نے کہا، جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہودیت اور نصرانیت نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو) یہ اُن لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں ہیں (اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو اگر تم (اس زعم میں) سچے ہو تو بتلاؤ تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں (بلاشبہ نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے مگر وہ خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) جس کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا، وہ نیک عمل بھی ہوا، تو خواہ وہ یہودی اور نصرانی ہو، خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی!

دوسری جگہ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا
وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ط

(۲: ۵۹)

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں، وہ ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں، یا نصاریٰ، اور صابی ہوں (کوئی بھی ہوں) لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی۔ وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو، لیکن اگر خدا پر سچا ایمان رکھتا ہے، اور اس کے اعمال بھی نیک ہیں، تو دینِ الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لئے نجات ہے۔ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی گروہ بندی کا قانون بنا دیا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا۔ اور اس کا نام "یہودیت" رکھ دیا۔ جو اس دائرہ کے اندر ہے، وہ سچائی پر ہے۔ اور اس کے لئے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے، وہ باطل ہے۔ اور اس کے لئے نجات نہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا، اور اس کا نام "مسیحیت" یا کلیسا رکھ دیا۔ جو اس میں داخل ہے۔ صرف وہی سچائی پر ہے، اور صرف اسی کے لئے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے، اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں، اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا عمل و اعتقاد، تو اس کا قانون یک قلم غیر مؤثر ہو گیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو، لیکن اگر "یہودیت" کی نسلی گروہ بندی یا "مسیحیت" کی جماعتی گروہ بندی میں داخل نہیں، تو اسے یہودی اور عیسائی ہدایت انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک سخت سے سخت بد عمل اور بد اعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا۔ اگر ان گروہ بندیوں میں داخل ہو گا۔ قرآن ان کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں نقل کرتا ہے: كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا۔ یعنی ہدایت کی راہ اعتقاد اور عمل کی راہ نہیں ہے۔ بلکہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی کی راہ ہے۔ جب تک کوئی یہودی یا نصرانی نہ ہو جائے، ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ خدا کی ہدایت جو دنیا کا عالمگیر قانون ہے، وہ بھلا ان خود ساختہ گروہ بندیوں میں کیونکر محدود ہو جا سکتی ہے؟ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ کے زور اور عموم پر غور کرو۔ کوئی انسان ہو، کوئی نسل و قوم اور گروہ بندی کا ہو، لیکن جس کسی نے بھی اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکا دیا، اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی، اس نے دین کی نجات و سعادت پا لی، اور اس کے لئے کوئی غم اور کھٹکا نہیں۔

غور کرو، مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا اس سے زیادہ واضح اور ہمہ گیر اعلان اور کیا ہو سکتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ
الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ
الْكِتَابَ ط كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا
يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ
يَخْتَلِفُونَ ٥

(۲: ۱۱۳)

اور یہودیوں نے کہا، عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے کہا، یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمہ (دینِ) ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب نے کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا اس بات میں باہم جھگڑ رہے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دے گا، اور اس وقت حقیقتِ حال سب پر کھل جائے گی۔

یعنی باوجودیکہ خدا کا دین ایک ہی ہے، اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے، پاس ہمہ مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذّب جتھے قائم ہو گئے ہیں۔ ہر جتھا دوسرے جتھے کو جھٹلاتا ہے اور ہر جتھا صرف اپنے ہی کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا ہے۔

سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے

سوال یہ ہے کہ جب دین کی راہ ایک ہونے کی جگہ بیشمار جتھوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی، اور ہر جتھا ایک ہی طریقہ پر اپنی سچائی کا مدعی ہے اور ایک ہی طریقہ پر دوسروں کو جھٹلا رہا ہے، تو اب اس بات کا فیصلہ ہو۔ کہ فی الحقیقت سچائی ہے کہاں؟ قرآن کہتا ہے، سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے۔ سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی اور سب کے لئے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا۔ لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی، "اور "الدین" پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔ اب ہر گروہ دوسرے گروہ سے لڑ رہا ہے، اور سمجھتا ہے، دین کی سعادت اور نجات صرف اسی کے ورثہ میں آئی ہے۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

عبادت گاہوں میں تفرقہ

سورۂ بقرہ میں مندرجۂ صدر آیت کے بعد ہی حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ
اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ
مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا
خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا
خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ؕ

(۲ : ۱۱۴)

اور غور کرو، اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اُس کے نام کی یاد سے مانع آئے، اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو؟ جن لوگوں کے ظلم و شرارت کا یہ حال ہے، یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم رکھیں۔ بجز اس حالت کے کہ (دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود دوسروں کی طاقت سے) ڈرے سہمے ہوئے ہوں۔ یاد رکھو، ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب۔

یعنی مذہبی گروہ بندی کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں، اور باوجودیکہ تمام پیروانِ مذاہب ایک ہی خدا کا نام لیوا ہیں، لیکن ممکن نہیں ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جا کر خدا کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ کو خدا کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ اس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ مذہب کے نام پر اٹھتا ہے اور دوسروں کی عبادت گاہیں منہدم کر ڈالتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، اس سے بڑھ کر انسان کا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لئے روکا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ یا ایک عبادت گاہ ڈھا دی جائے اور اس لئے ڈھا دی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، دوسرے گروہ کی بنائی ہوئی ہے؟ کیا تمہارے بنائے ہوئے مذہبی جتھوں کے اختلاف سے خدا بھی مختلف ہو گئے؟ اور اس لئے ایک جتھے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ تو خدا کی عبادت گاہ ہوئی، مگر دوسرے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ نہیں؟

وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ   اور (یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہیں گے) یہ

قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَن يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○

(۳ : ۷۳)

یہ بات کبھی نہ مانو کہ دین کی جو سعادت تمہیں دی گئی ہے (یعنی یہودیوں کو دی گئی ہے) ویسی اب کسی دوسرے انسان کو مل سکے، یا اللہ کے حضور تمہارے خلاف کسی کی کوئی حجت چل سکے، (اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہدو، ہدایت تو وہی جو اللہ کی ہدایت ہے) اور فضل و بخشش کا سر رشتہ تمہارے ہاتھ نہیں ہے، اللہ کے ہاتھ ہے جسے چاہے دے۔ وہ اپنے فضل میں، بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی یہودیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وحی و نبوت کی ہدایت جو انہیں دی گئی ہے، وہ صرف انہی کے لئے ہے۔ ممکن نہیں، کسی دوسرے انسان یا قوم کو یہ بات حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اسی بناء پر وہ کہتے ہیں، اپنے مذہب کے آدمیوں کے علاوہ اور کسی کی سچائی اور بزرگی تسلیم نہ کرو، اور نہ یہ بات مانو کہ تمہارے خلاف (یعنی یہودیوں کے خلاف)، کسی آدمی کی کوئی دلیل خدا کے حضور مقبول ہو سکتی ہے۔ قرآن اس زعم باطل کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے "إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ" ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے، اور اللہ کا فضل کسی ایک انسان یا گروہ ہی کے لئے نہیں ہے، سب کے لئے ہے، پس جو انسان بھی ہدایت کی راہ چلے گا۔ ہدایت یافتہ ہوگا۔ خواہ یہودی ہو یا کوئی ہو۔

یہودی اپنے آپ کو نجات یافتہ امت سمجھتے تھے اور کہتے تھے، دوزخ کی آگ ہم پر حرام کر دی گئی ہے

یہودیوں کی گروہ بندی کا غرور یہاں تک بڑھ گیا تھا، کہ کہتے تھے، خدا نے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کر دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی آدمی جہنم میں ڈالا بھی ڈالا جائے گا، تو اس لئے نہیں کہ اسے عذاب میں ڈالا جائے اس لئے کہ گناہ کے داغ دھبوں سے پاک و صاف کر دیا جائے، اور پھر جنت میں جا داخل ہو۔ قرآن ان کا یہ زعم باطل جابجا نقل کرتا ہے۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے پوچھتا ہے، یہ بات تمہیں کہاں سے معلوم ہو گئی کہ یہودی گروہ بندی کا ہر فرد نجات یافتہ ہے؟ اور عذاب اخروی سے اُسے چھٹکارا مل چکا ہے؟ کیا تمہیں خدا نے غیر مشروط نجات کا کوئی پٹہ لکھ کر دے دیا ہے کہ جہاں ایک انسان یہودی ہوا، اور آتش دوزخ اُس پر حرام ہو گئی؟ اگر نہیں دیا ہے، تو پھر بتلاؤ، ایسا اعتقاد رکھنا خدا پر افترا نہیں ہے؟ اُس کے بعد صاف صاف لفظوں میں خدا کے قانونِ عمل کا اعلان کرتا ہے، "جس کسی نے بھی اپنے عمل سے بُرائی کمائی اس کے لئے برائی ہے۔ جس کسی نے بھی بھلائی کمائی، اس کے لئے بھلائی ہے۔" یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے، خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی، اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے، خواہ پینے والا کسی نسل و قوم اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا ایک خاصہ ہے، اور وہ اس لئے بدل نہیں جا سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا گروہ بندی کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقر میں ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(۲: ۸۱)

اور ان لوگوں نے (یعنی یہودیوں نے) کہا ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں، اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند دنوں کے لئے چھوئے (اے پیغمبر) ان سے کہو، یہ جو تم کہتے ہو، تو کیا تم نے خدا سے کوئی قول و قرار کرا لیا ہے، اور اب وہ اپنے قول و قرار سے پھر نہیں سکتا یا پھر تم خدا کے نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ نہیں، (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو، لیکن) جس کسی نے بھی برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا، تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے، ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا۔ اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا، تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے۔ ہمیشہ بہشت میں رہنے والا۔

قانون نجات کا اعلان عام

سورۂ نساء میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو، بلکہ سب کو مخاطب کر کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے۔ ایسا اعلان، جس کے بعد کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ط

(۴: ۱۲۳)

(مسلمانو! یاد رکھو، نجات اور سعادت) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی برائی کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا، اور پھر نہ تو کسی کی دوستی بچا سکے گی، نہ کسی طاقت کی مددگاری۔

یہودی سمجھتے تھے، غیر مذہب والوں کے ساتھ معاملت میں دیانتداری ضروری نہیں۔ قرآن کا اس پر انکار

اسی مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے، سچائی اور دیانتداری کے جس قدر بھی احکام ہیں، وہ اس لئے نہیں ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ عمل میں لائے جائیں، بلکہ محض اس لئے ہیں کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کے ساتھ بد دیانتی نہ کرے وہ کہتے تھے اگر ایک آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے۔ تو ہمارے لئے جائز ہے کہ جس طرح بھی چاہیں، اس کا مال کھا لیں، کچھ ضروری نہیں کہ راست بازی و دیانت کے اصول ملحوظ رکھے جائیں، چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو انہوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، اور آج تک ان کا طرز عمل یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک یہودی کو دوسرے یہودی سے ظالمانہ سود نہیں لینا چاہیے، لیکن ایک یہودی، غیر یہودی سے لے، تو کوئی مضائقہ نہیں، قرآن ان کے اس عقیدہ کا ذکر کرتا، اور اسے ان کی بہت بڑی گمراہی قرار دیتا ہے۔

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ط (۴: ۵۹)

اور ان کا سود کھانا، حالانکہ وہ اس سے روک دیئے گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے پر کھا لیتے تھے۔

اسی طرح جو یہودی عرب میں آباد تھے، وہ کہتے تھے، عرب کے ان پڑھ باشندوں کیساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی و دیانت داری کچھ ضروری نہیں۔ یہ لوگ بت پرست ہیں، ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھالیں، ہمارے لئے جائز ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ط

(۳ : ۷۰)

(یہودیوں کی، یہ (بدمعاملگی)، اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں (عرب کے) ان پڑھ لوگوں سے (بدمعاملگی کرنے میں) ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی (جس طرح بھی ہم چاہیں، ان کا مال کھاسکتے ہیں حالانکہ) ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں۔ ہاں، (ان سے باز پرس ہوا اور ضرور ہو، کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی سے بچتا ہے، تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے، اور اللہ برائی سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا ہے۔ خدا کا دین تو یہ ہے۔ کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے۔ اور ہر حال میں راست بازی و دیانت داری کی راہ چلنی چاہیئے، خواہ کوئی انسان ہو، اور کسی عقیدہ اور گروہ کا ہو، کیونکہ سفید ہر حال میں سفید ہے، اور سیاہ ہر حال میں سیاہ۔ کوئی سفید چیز اس لئے کالی نہیں ہو جاسکتی کہ کس آدمی کو دی گئی ہے۔ اور کوئی کالی چیز اس لئے سفید نہیں ہو جاسکتی کہ کس نسل اور کس گروہ کے ہاتھوں نکلی ہے۔ پس دیانتداری ہر حال میں دیانتداری ہے، اور بد دیانتی ہر حال میں بد دیانتی۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت سے استشہاد

نزول قرآن کے وقت بڑے مذہبی گروہ عرب میں تین تھے، یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب، اور یہ تینوں حضرت ابراہیم علیہ السلام، کی شخصیت کو یکساں طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، کیونکہ تینوں گروہوں کے مورث اعلیٰ وہی تھے۔ پس قرآن مذہبی گروہ بندی کی گمراہی واضح کرنے کے لئے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر دین کی سچائی گروہ بندیوں کے ساتھ وابستہ ہے تو بتلاؤ حضرت ابراہیمؑ کس گروہ بندی کے آدمی تھے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا۔ نہ مسیحیت کا، اور نہ کوئی دوسری گروہ بندی ہی موجود تھی۔ پھر اگر حضرت ابراہیمؑ کسی گروہ بندی میں داخل نہ ہونے پر بھی دین کی راہ پر تھے، تو بتلاؤ، وہ کونسی تھی؟ قرآن کہتا ہے، وہ اسی دین حقیقی کی راہ تھی، جو تمہاری تمام بنائی ہوئی گروہ بندیوں سے بالاتر، اور نوع انسانی کے لئے عالمگیر قانون نجات ہے، یعنی خدا کی موحدانہ پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ط قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(۲ : ۱۲۹)

اور یہودی کہتے ہیں، یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤگے۔ نصاریٰ کہتے ہیں، نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤگے (اے پیغمبر!) تم کہو نہیں (اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری ان گروہ بندیوں کی پابند نہیں ہو جاسکتی) ہدایت کی راہ تو وہی حقیقی راہ ہے۔ جو ابراہیم کا طریقہ تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

سورۂ آل عمران میں یہی مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہے۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ
فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ
وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳:۱۵۸)

اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اس کے بعد۔ پھر کیا اتنی صاف بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟

یعنی وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال کرتا ہے۔ تمہاری ان گروہ بندیوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل کے ظہور تک جاسکتی ہے۔ کیونکہ اُنہی کی نسبت سے گروہ بندیوں کے حلقے کھینچے گئے ہیں اچھا، بتاؤ، تورات اور انجیل کے ظہور تک جاسکتی ہے۔ کیونکہ اُنہی کی نسبت سے گروہ بندیوں کے حلقے کھینچے گئے ہیں۔ اچھا، بتاؤ، تورات سے پہلے بھی ہدایت یافتہ انسان موجود تھے یا نہیں۔ اگر تھے تو اُن کی راہ کیا تھی؟ خود تمہارے اسرائیلی گھرانے کے تمام نبیوں کی راہ کیا تھی؟ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جس دین کی تلقین کی، وہ دین کونسا تھا؟ حضرت یعقوبؑ جب بستر مرگ پر تھے اور اپنے بیٹوں کو دینِ الٰہی پر قائم رہنے کی وصیت کر رہے تھے، تو اُس دین سے مقصود کونسا دین تھا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ یہودیت یا مسیحیت کی گروہ بندی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ دونوں گروہ بندیاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے نام پر کی گئی ہیں، اور حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب وغیرہم سے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے، پس معلوم ہوا، تمہارے ان خود ساختہ حلقہ ہائے نجات سے بھی کوئی بالاتر راہِ نجات موجود رہی ہے، جو اُس وقت بھی نوع انسانی کے سامنے موجود تھی، جب ان حلقہ بندیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے، یہی راہ نجات، دین کی اصلی راہ ہے، اور اسے حاصل کرنے کے لیے کسی گروہ بندی کی نہیں بلکہ اعتقاد اور عمل کی ضرورت ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ
الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهِیْمَ وَ
اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ
وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝
(۲:۱۱۲)

پھر کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی، اور اس نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا، بتلاؤ، میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے، اور تیرے بزرگوں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے کی ہے، اور ہم خدا کے حکموں کے فرمانبردار ہیں۔

اصلِ دین وحدت و اخوت ہے۔ نہ کہ تفرقہ و منافرت

وہ کہتا ہے، دینِ الٰہی کی اصل، نوع انسانی کی اخوت و وحدت ہے، نہ کہ تفرقہ و منافرت۔ خدا کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے، سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلاً ایک ہی امت ہو، اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، پس چاہیئے کہ سب اُسی ایک پروردگار کی بندگی کریں، اور ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اگرچہ ہر مذہب کے داعی نے اسی راہ کی تعلیم دی۔ لیکن ہر مذہب کے پیروؤں نے اس سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک، ہر قوم، ہر نسل نے اپنے اپنے جتھے الگ الگ بنالئے اور ہر جتھا اپنے طور طریقہ میں گُم ہوگیا۔

قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذہب کے بانیوں میں سے جن جن رہنماؤں کے مواعظ نقل کئے ہیں، اُن سب میں بھی اصل اصول یہی حقیقت ہے، اور عموماً اکثر مواعظ کا خاتمہ دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی

تعلیم ہی پر ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ مومنون میں سب سے پہلے حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت کا ذکر کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (۲۳ : ۲۳)

اس کے بعد ان دعوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد ظاہر ہوتی ہیں:-

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۳۲)

پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے:- ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ○ (۴۵) حضرت موسیٰ کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت نمایاں ہوئی:- وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً (۵۲) پھر ان تمام دعوتوں کے بعد یہ صدائے حق بلند ہوتی ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
عَلِيْمٌ ؕ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً
وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ؕ
فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ
كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○
(۲۳ : ۵۳)

"اور ہم نے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا تھا کہ پاک و صاف چیزیں کھاؤ، اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور (دیکھو) یہ تمہاری قوم درحقیقت ایک ہی قوم ہے، اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس نافرمانی سے بچو! لیکن پھر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر، جدا جدا دین بنا لئے۔ ہر ٹولی کے پلے جو کچھ پڑ گیا ہے۔ اُسی میں مگن ہے۔

یعنی تمام رسولوں نے یکے بعد دیگرے یہی تعلیم دی تھی کہ خدا کی بندگی کرو اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرو۔ تم سب خدا کے نزدیک ایک ہی امت ہو۔ اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کو اپنے سے الگ نہ سمجھے، نہ کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مخالف ہو جائے۔ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا لیں۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ اب ہر ٹولی اُسی میں مگن ہے جو اُس کے پلے پڑ گیا ہے۔

رسمِ اصطباغ

مذہبی گروہ بندی کی رسموں میں سے ایک رسم وہ ہے جو عیسائی کلیسا نے اختیار کر رکھی ہے اور جسے وہ اصطباغ (بپتسما) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اُس وقت ادا کی جاتی تھی۔ جب لوگ گناہوں سے توبہ کیا کرتے تھے، اور اس لئے فی نفسہٖ ایک مقررہ رسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن عیسائیوں نے اسے انسانی نجات و سعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص مسیح علیہ السلام کے نام پر اصطباغ نہ لے، وہ نجات یافتہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے، یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات و سعادت جس کا دار و مدار عمل و اعتقاد پر ہے محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے؟ انسانوں کا یہ ٹھہرایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے۔ اللہ کا اصطباغ تو یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ
صِبْغَةً ؗ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (۲ : ۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دینِ الٰہی قدرتی اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اُسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

قانونِ عمل

اسی طرح وہ سورۂ بقرہ میں بار بار کہتا ہے۔ دینِ الٰہی، عمل کا قانون ہے، اور ہر انسان کے لئے وہی ہونا ہے جو اُس کے عمل کی کمائی ہے۔ یہ بات کہ ایک گروہ میں بہت

سے بنی ہیں اور برگزیدہ انسان ہو چکے ہیں ، یا نیک انسانوں کی نسل میں سے ہے ۔ یا کسی پچھلی قوم سے رشتۂ قدامت رکھتا ہے ، نجات و سعادت کے لئے کچھ سود مند نہیں :-

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(۲ : ۱۴۱)

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی ، اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ، اور تمہارے لئے وہ ہے جو اپنے عمل سے کماؤ ۔ تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی کہ ان کے عمل کیسے تھے ۔

قرآن کی دعوت

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں ، کوئی بات بھی قرآن کے صفحوں پر اس درجہ نمایاں نہیں ہے ، جس قدر یہ بات ہے ۔ اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے ، بلکہ چاہتا ہے ، تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے ، اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور متفقہ راہ ہے ۔

وہ بار بار کہتا ہے ۔ جس راہ کی میں دعوت ہوں ، وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے ، اور نہ سچائی کی راہ نئی ہو سکتی ہے ۔ یہ وہی راہ ہے جو اول روز سے موجود ہے ، اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی کی طرف بلایا ہے :-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

(۴۲ : ۱۳)

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوح ؑ کو کی گئی تھی ، اور جس پر چلنے کا ابراہیم ؑ اور موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ کو حکم دیا تھا ۔ ان سب کی تعلیم یہی تھی ، کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو ، اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ ۔

سورۂ نساء میں ہے :-

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ؕ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوح ؑ کو کیا تھا ، اور ان تمام نبیوں ؑ کو کیا تھا ، جو نوح ؑ کے بعد ہوئے ۔ نیز جس طرح ابراہیم ؑ ، اسمٰعیل ؑ ، اسحٰق ؑ ، یعقوب ؑ ، اولادِ یعقوب ، یونس ؑ ، ہارون ؑ ، سلیمان ؑ (وغیرہم) کو مخاطب کیا ، اور داؤد ؑ کو زبور عطا کی ۔ علاوہ بریں وہ رسول ، جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سنا چکے ہیں ، اور بعض ایسے ہیں ۔ جن کا حال تمہیں نہیں سنایا ۔

سورۂ انعام میں پچھلے رسولوں کا ذکر کر کے پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کیا ہے ، اور کہا ہے :-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ

(۶ : ۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہِ حق دکھلائی ، پس (اے پیغمبر!) تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو ۔

سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اس کی دعوت کا اصل اصول ہے

اسی لئے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیانِ مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیغامبر تھے، سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی، اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ
اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ
مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(۸۳ : ۳)

(اے پیغمبر!) کہدو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لائے ہیں۔ نیز جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوا ہے، اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار سے دیا گیا ہے، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں، دوسروں کو مانیں) اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں ہو اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو، ہمیں سب پر ایمان ہے)

تفریق بین الرسل

قرآن نے اس آیت میں اور نیز متعدد موقعوں پر "تفریق بین الرسل" کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے، اور سچائی کی راہ یہ بتلائی ہے کہ "تفریق بین الرسل" سے انکار کیا جائے "تفریق بین الرسل" کے معنی یہ ہیں۔ کہ خدا کے رسولوں میں باعتبارِ تصدیق، تفرقہ و امتیاز کرنا۔ یعنی ایسا سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا، فلاں سچا نہ تھا۔ یا کسی ایک کی تصدیق کرنی، باقی سب سے انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی، کسی ایک سے انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی دعوتوں پر ایمان لائے۔ اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہے، سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہے، اور جس کی زبان پر بھی ظاہر ہوئی ہے، سچائی ہے، اور میرا اس پر ایمان ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَ
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ قف لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ قف
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ
الْمَصِيْرُ ۝

(۲۸۵ : ۲)

اللہ کا رسول اُس دکلام حق پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے، اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں۔ یہ سب اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اُس کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) انہوں نے کہا، خدایا! ہم نے تیرا پیام سنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو، ہم سب کو بالآخر تیری طرف لوٹنا ہے۔

وہ کہتا ہے، خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے، لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے۔ پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو۔ دوسروں کا انکار کر دیتے ہو، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو۔ یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، ردّ بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے، کہ ایسا ماننا، ماننا نہیں ہے، بلکہ ایک زیادہ بری قسم کا انکار ہے۔

خدا کی سچائی اُس کی عالمگیر بخشش ہے

وہ کہتا ہے، خدا کی سچائی، اس کی ساری باتوں کی طرح، اس کی عالمگیر بخشش ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص زمانہ سے وابستہ کی جاسکتی ہے۔ نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لئے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں بنالی ہیں۔ لیکن تم خدا کی سچائی کے لئے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے۔ اس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے۔ نہ جغرافیائی حد بندی ہے، نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈھ میں ہو، تو اُسے کسی ایک ہی گوشہ میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے، اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمہیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا، اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو تمہاری متاع ہے اور تم اسکے وارث ہو۔

راہیں صرف دو ہیں: ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو۔ انکار کی یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دو

چنانچہ اُس نے جا بجا "تفریق بین الرسل" کی راہ کو انکار کی راہ قرار دیا ہے، اور ایمان کی راہ یہ بتلائی ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے وہ کہتا ہے، یہاں راہیں صرف دو ہی ہیں، تیسری نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مانو۔ انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کرو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَ
رُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ
نَكْفُرُ بِبَعْضٍ لا وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا
بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ
مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ
أُجُورَهُمْ ط وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا
رَحِيمًا ۝ (۴ : ۱۴۹)

جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں، اور چاہتے ہیں، اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں کسی کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں، بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور پھر اس طرح چاہتے ہیں، کفر اور ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کریں، تو یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہے، تو ان کے لئے رسوا کن عذاب تیار ہے لیکن ہاں جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی سچائی سے بھی انکار

نہیں کیا) تو بلا شبہ یہی لوگ ہیں جنہیں عنقریب اللہ ان کے اجر عطا فرمائے گا، اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے!

سورۂ بقرہ میں جو سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورت ہے۔ سچے مومنوں کی راہ یہ بتلائی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ
مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ
يُوْقِنُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(۲: ۵،۴)

اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے اور اُن تمام سچائیوں پر جو اُن سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور نیز آخرت کی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں، اور یہی ہیں جنہوں نے فلاح پائی۔

جب سب ایک ہی خدا کے پرستار ہیں اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق نتیجہ ملنا ہے، تو پھر دین کے نام پر نزاع کیوں ہو؟

وہ کہتا ہے۔ اگر تمہیں اس بات سے انکار نہیں کہ تمام کارخانۂ ہستی کا خالق ایک ہی ہے۔ اور اُسی کی پروردگاری یکساں طور پر، ہر مخلوق کو پرورش کر رہی ہے، تو پھر تمہیں اس بات سے کیوں انکار ہو کہ اس کی روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر تمام نوع انسانی کو دیا گیا ہے؟ وہ کہتا ہے، تم سب کا پروردگار ایک ہے، تم سب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہو، تم سب کے رہنماؤں نے تمہیں ایک ہی راہ دکھلائی ہے۔ پھر یہ کیسی گمراہی کی انتہا اور عقل کی موت ہے کہ رشتہ ایک ہے، مقصد ایک ہے، راہ ایک ہے، لیکن ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہے: اور ہر انسان دوسرے انسان سے متنفر۔ اور پھر یہ تمام جنگ و نزاع کس کے نام پر کی جا رہی ہے؟ اُسی خدا کے نام پر، اور اسی خدا کے دین کے نام پر، جس نے سب کو ایک ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا۔ اور سب کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں جکڑ دیا تھا؟

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ
مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ
اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

(۵ : ۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہل کتاب! تم جو ہماری مخالفت میں کمربستہ ہو گئے ہو، تو بتلاؤ اس کے سوا ہمارا جرم کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ہم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، سب پر ایمان رکھتے ہیں؟ (پھر کیا خدا پرستی اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے؟ افسوس تم پر!) تم میں اکثر ایسے ہی ہیں جو راہِ حق سے یکسر برگشتہ ہیں!

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ؕ (۱۹ : ۳۶)

دیکھو، خدا تو میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے، پس اُسی کی بندگی کرو۔ یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا
وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

(اے پیغمبر! ان سے کہو) کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو، حالانکہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار

أَعْمَالُكُمْ ج وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ط (۲ : ۱۳۹)

وہی ہے۔ اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں۔ تمہارے لئے تمہارے اعمال (یعنی ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے۔ پھر اس بارے میں جھگڑا کیوں ہو؟)

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیسا کہ آیات مندرجہ صدر میں ہے:- اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ۔ اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ یا۔ اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ "ہمارا اور تمہارا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے" یا "اَتُحَاجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ج وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" "کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے، اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں تمہارے لئے تمہارے" تو ان تمام مخاطبات سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لئے ویسا ہی نتیجہ جیسا کہ اس کا عمل ہے، تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ و جدال کیوں برپا ہے؟ وہ بار بار کہتا ہے۔ میری تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہوں، میں کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا میں کسی رہنما سے انکار نہیں کرتا ہوں سب کی یکساں تصدیق" اور سب کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم "میرا دستور العمل ہے، پھر میرے خلاف تمام پیروانِ مذاہب نے کیوں اعلان جنگ کر دیا ہے؟

قرآن کا پیروانِ مذاہب سے مطالبہ

اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کرلے بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے اگر تم نے ایسا کر لیا، تو میرا کام پورا ہو گیا، کیونکہ جونہی تم اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹو گے، تمہارے سامنے وہی حقیقت آ موجود ہوگی جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے، وہی قدیم اور عالمگیر پیام ہے۔ جو تمام بانیانِ مذاہب دے چکے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ج فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ

اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی اور ان تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں، حقیقت قائم نہ کرو، اس وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور (اے پیغمبر) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے وہ بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں، تم دیکھو گے کہ، ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا، تو جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کرلی ہے تم ان کی حالت پر بیکار کو غم نہ کھاؤ۔ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں جو نصاری ہیں، (یہ ہوں یا کوئی ہو) ہر کوئی بھی

صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝
(۵: ۶۸: ۶۹)

اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اُن راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ جو نزولِ قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے۔ اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔ البتہ وہ کہتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ غالب تعداد اُنہی لوگوں کی ہے۔ جنہوں نے دین الٰہی کی اعتقادی اور عملی حقیقت یک قلم ضائع کر دی ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳: ۱۲: ۱۱۵)

یہ بات نہیں ہے کہ سب ایک ہی طرح کے ہوں۔ انہی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں: اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں، اور بلا شبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں۔ اور (یاد رکھو) یہ لوگ جو کچھ بھی نیکی کرتے ہیں، تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے۔ وہ جانتا ہے کہ کس گروہ میں، کون پرہیزگار ہے۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں، بُرا ہی کرتے ہیں۔

یہ جو قرآن جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے، جھٹلانے والا نہیں، اور اہل کتاب سے بار بار کہتا ہے:- وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲: ۳۸) اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نمایاں ہوئی ہے، تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب میری تعلیم تمہارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی نیا دین نہیں پیش کرتی، اور نہ اُن سے تمہیں منحرف کرانا چاہتی ہے، بلکہ سر تا سر مصدق اور مؤید ہے، تو پھر تم میں اور مجھ میں نزاع کیوں ہے؟ کیوں تم میرے خلاف اعلانِ جنگ کر دو؟

اصطلاح قرآنی میں "المعروف" اور "المنکر"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے نیکی کے لئے "معروف" کا اور بُرائی کے لئے "منکر" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳۱: ۱۷) معروف "عرف" ہے۔ جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ پس "معروف" وہ بات ہوئی جو جانی پہچانی بات ہو۔ "منکر" کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس سے عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ پس قرآن نے نیکی اور بُرائی کے لئے یہ الفاظ اس لئے اختیار کئے کہ وہ کہتا ہے۔ دنیا میں عقاید و افکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں۔ جن کے اچھے

ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور کچھ باتیں ایسی ہیں، جن کے برے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً:- اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دیانتداری اچھی بات ہے۔ بددیانتی برائی ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبرگیری، مظلوم کی دادرسی، انسان کے اچھے اعمال ہیں، اور ظلم اور بدسلوکی برے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں، جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے، اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابل انکار و اعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکمتیں، دنیا کی تمام جماعتیں، دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں لیکن جہاں تک ان اعمال کا تعلق ہے، سب ہم آہنگ و ہم رائے ہیں۔

قرآن کہتا ہے، یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوع انسانی نے جانی بوجھی ہوئی ہے، دین الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے، اور جن کی برائی پر تمام مذاہب متفق ہیں۔ دین الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصل حقیقت تھی، اس لئے اس میں اختلاف نہ ہو سکا، اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم و مسلّم رہی۔ ان اعمال کی اچھائی اور برائی پر نوع انسانی کے تمام عہدوں، تمام مذہبوں، اور تمام قوموں کا عالمگیر اتفاق؟ ان کی فطرت اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، میں انہی باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں، جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے، اور انہی باتوں سے روکتا ہوں، جن سے عام طور پر نوع انسانی نے انکار کیا ہے۔ یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں۔ منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے تو پھر کسی انسان کو بھی راست بازی سے اختلاف نہیں، کیوں مجھ سے اختلاف ہو؟

"الدین القیم" اور "فطرت اللہ"

وہ کہتا ہے یہی راہِ عمل، نوع انسانی کے لئے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے، اور فطرت کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی "الدین القیم" یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں، یہی "دینِ حنیف" جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی اسی کا نام میری اصطلاح میں "الاسلام" یعنی خدا کے ٹھہرائے قوانین کی فرمانبرداری۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ
عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ
وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا
دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ ۭ
بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝
(۳۰ : ۳۰)

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر "الدین" کی طرف رخ کرو۔ یہی خدا کی بناوٹ ہے۔ جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی "الدین القیم" (یعنی سیدھا اور سچا دین) ہے۔ لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے (دیکھو) سب ایک خدا کی طرف متوجہ رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو، نماز قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اسی میں مگن ہے۔

"الاسلام"

وہ کہتا ہے، خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے، وہی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے، وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس اگر تم خداپرستی اور عمل صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے، جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آ جاؤ۔ تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں؟

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ط وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ ط وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ط فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ط وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ج وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ ط وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ط

(۳:۱۸)

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے، اور وہ "الاسلام" ہے، اور یہ جو اہل کتاب نے اختلاف کیا (اور ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ گئے) تو یہ اس لئے ہوا کہ اگرچہ علم و حقیقت کی راہ اُن پر کھل چکی تھی، لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف میں پڑ گئے اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ کا قانون مکافات بھی حساب لینے میں سست رفتار نہیں ط

پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں تو تم کہو، میری اور میرے پیروؤں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینا، اور ہم نے سر جھکا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب سے اور ان پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو، تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑ دو، یہ بتلاؤ، تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں؟) اگر وہ جھک گئے تو سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور، انہوں نے راہ پالی، اگر روگردانی کریں، تو تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیام حق پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں! ؎

اس نے دین کے لئے "الاسلام" کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرمان برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے، اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں، تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ط (۳:۸۲)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چار و ناچار اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون عمل کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اور بالآخر سب کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔

وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، تو اس کا مطلب یہی

ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا، جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے، انسانی ساخت کی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دینِ حقیقی کی راہ تمام مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے، وہیں متصلاً یہ بھی کہدیا ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳ : ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو، اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی، اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔

اور اسی لئے وہ تمام پیروانِ دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں، اور اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے، میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جان نثار بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیحؑ کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا، ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا، ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے، ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اسی حصّے میں آئی ہے، ان سب کو دعوتِ قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے، اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ، ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے، اور سب کی بتلائی ہوئی متفقہ راہِ ہدایت پر گامزن ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳ : ۱۰۳)

اور (دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو، اللہ نے تم پر جو فضل و کرم کیا ہے اسے یاد کرو۔ تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم دگر الفت پیدا کر دی۔ پھر ایسا ہوا کہ انعامِ الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے! اور (دیکھو) تمہارا حال یہ تھا گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے، عین اس کے کنارے کھڑے ہو، لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اسی طرح اپنی (کلام فہمی کی) نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ ہدایت پاؤ۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳ : ۱۰۵)

اور (دیکھو) اُن لوگوں کی سی چال اختیار نہ کرو جو (ایک دین پر رہنے کی جگہ) جدا جدا ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، باوجودیکہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں (یاد رکھو) یہی لوگ ہیں جن کے لئے (کامیابی و فلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶ : ۱۵۵)

(اور دیکھو) یہ میری راہ ہے، بالکل سیدھی راہ پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم نافرمانی سے بچو

قرآن اور اُس کے مخالفوں میں بنائے نزاع

اب چند لمحوں کے لئے اُس نزاع پر غور کرو۔ جو قرآن اور اس کے مخالفوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ یہ مخالف کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے۔ جن میں سے بعض کے پاس کتاب تھی بعض کے پاس نہ تھی۔

اچھا بنائے نزاع کیا تھی؟

کیا تھی کہ قرآن نے ان کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا اُن کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا؟ اور اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کمربستہ ہوگئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے ہی حصہ میں آئی ہے، اور تمام پیروانِ مذاہب کو چاہیئے، اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں؟

یا پھر اس نے دین کے نام سے کوئی ایسی بات پیش کر دی تھی جو پیروانِ مذاہب کے لئے بالکل نئی بات تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر انہیں ماننے میں تامل تھی؟

قرآن کے صفحے کھلے ہوئے ہیں، اور اس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے، یہ دونوں ہمیں بتلاتے ہیں کہ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ اُس نے نہ صرف ان رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آچکے ہیں، میں سب کی تصدیق کرتا ہوں، اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔ اُس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے، بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے، اس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتلایا۔ اُس نے ہمیشہ انہی باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے۔ تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سرِ نو تازہ کر لو۔ تمہارا ایسا کرنا ہی، مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر ان میں اس کے مخالفوں میں بنائے نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا۔ سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے، اور ہمیشہ انہی باتوں کی تلقین کرتا ہے، جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جا سکتا ہے کہ قریشِ مکّہ کی مخالفت اس بناء پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا۔ اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے؟ عیسائی کیوں برسرِ پیکار ہو گئے جنہوں نے بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ جھٹلاتا کیوں ہے؟ بلکہ اس لئے کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ انہیں جھٹلاتا کیوں ہے۔ بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا، اور یہیں آکر اُس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اس پہ کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کیا جائے؟ لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دار و مدار اعتقاد و عمل پہ ہے نہ کہ کفارہ... اور اصطباغ پر، اور قانونِ نجات کی یہ عالمگیر وسعت عیسائی کلیسا کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

اسی طرح قریش مکہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی خوش دل صدا نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے، تو ان کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے، ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں، جو اُن کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑے کرتے ہیں۔

تین اصول جو قرآن میں اور اس کے مخالفوں میں بناءِ نزاع ہوئے

مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے، جو اس میں اور تمام پیروانِ مذاہب میں وجہ نزاع ہو گئے۔

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروانِ مذاہب یہ مان لیتے، تو انہیں تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ سب کو یکساں طور پر ملی ہے، لیکن یہی ماننا ان کی گروہ پرستی پہ شاق گزرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا ہے، نجات اور سعادت کا دار و مدار اعتقاد و عمل پہ ہے۔ نسل، قوم، گروہ بندی، اور ظاہری رسم ریت پر نہیں ہے۔ اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے، تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز، تمام نوعِ انسانی پر کھل جاتا، اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی ٹھیکیداری باقی نہ رہتی، لیکن اس بات کے لئے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

(۳) وہ کہتا تھا، اصل دین خدا پرستی ہے۔ اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک خدا کی براہِ راست پرستش کی جائے، لیکن پیروانِ مذاہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے، اور گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے۔ لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے مالوف و معتاد طریقوں سے دست بردار ہو جائیں۔

خلاصۂ بحث

متذکرہ صدر تفصیلات کا حاصل حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں خاندانوں، اور قبیلوں کی معاشرتی حدبندیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا، دین کی سچائی صرف اُسی کے حصہ میں آئی ہے۔ جو انسان اس کی مذہبی حدبندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اُس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ جونہی ایک انسان انہیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اُسے حاصل ہوگئی۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے، اور ہر گروہ کے اجتماعی مقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں، جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے، نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے۔ اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اُس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

الف۔ اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ بلکہ صاف صاف کہدیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا، دین خدا کی عام بخشش ہے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

ب۔ اس نے کہا، خدا کے تمام قوانینِ فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور سب کے لئے ہے۔ پس پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں، اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

ج۔ اس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوعِ انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو۔ اس لئے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے کے لئے آئی تھی، اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے؟

د۔ اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا۔ اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو، ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

ہ۔ اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا کا ٹھہرایا

ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے، ایمان اور عمل صالح کا قانون۔

و۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروان مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں، تو میرا کام پورا ہو گیا، اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے۔ جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

ز۔ وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے، اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتۂ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصود اسی کی بندگی ہے۔ جب ہر انسان کے لئے وہی ہونا ہے۔ جیسا کچھ اس کا عمل ہے۔ تو پھر خدا اور مذہب پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے۔ بلکہ باہمی نفرت نفرت و مخاصمت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مخاصمت کیونکر دور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروان مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لئے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں۔ پس اگر ان کے دعاوی مان لئے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بہ یک وقت سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی ہے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے۔ کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں تو پھر مذہب کی سچائی کہاں؟ پس اگر کوئی صورت رفع نزاع کی ہو سکتی ہے تو وہ وہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے۔ تمام مذاہب سچے ہیں کیونکہ اصل دین ایک ہے اور سب کو دیا گیا ہے۔ لیکن تمام پیروان مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کیونکہ دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنائی ہیں اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام تر نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اصلاً وہی ہے، جو اور تمام گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت "الدین" ہے۔ یعنی نوع انسانی کے لئے حقیقی دین، اور اسی کو وہ "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

(۷) نوع انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے تھے، سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے۔ سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں۔ سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن سینکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و وضیع اور ادنیٰ و اعلیٰ کے بہت سے درجے ٹھہرا لئے گئے۔ ایسی حالت میں کون سا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جا سکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ۔ یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر دے سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں ایک جہتی اور یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ کہ ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آسکیں۔

صراطِ مستقیم

اسی بناء پر سورۂ فاتحہ میں جس دعا کی تلقین کی گئی، وہ "صراط مستقیم" پر چلنے کی طلبگاری ہے۔ صراط کے معنی راہ کے ہیں، اور "مستقیم" کے معنی سیدھا ہونے کے۔ پس "صراط مستقیم" ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہ ہو۔ پھر اس کی راہ پہچان یہ بتلائی کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ؁ یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر خدا کا انعام ہوا۔ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے۔ نہ اُن کی جو گمراہ ہیں۔

یہ انعام یافتہ انسان کون ہیں جن کی راہ سیدھی راہ ہوئی؟ قرآن نے جا بجا واضح کیا ہے۔ کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گذر چکے ہیں۔ انعام یافتہ انسان ہیں، اور انہیں کی راہ صراطِ مستقیم ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ
وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ۝
(۴: ۶۹)

اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے، صدیقوں کی ہے شہداء کی ہے۔ نیک عمل انسانوں کی ہے، اور جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں تو کیا ہی اچھی اس کی رفاقت ہے۔

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور انہیں انعام یافتہ قرار دیا ہے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔

"انبیاء" سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغامبر ہیں جو نوع انسانی کی ہدایت کے لئے پیدا ہوئے۔

"صدیق" سے مقصود ایسے انسان ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں۔ یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلے ہوئے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات اُن کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے۔

"شہید" کے معنی گواہ کے ہیں۔ یعنی ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق و صداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔

"صالحین" سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عملی کی راہ میں استقامت رکھیں اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں۔

پس معلوم ہوا۔ انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے تمام رسول اور داعیانِ حق ہیں جو قرآن کے نزول سے پہلے دنیا میں پیدا ہو چکے تھے، اور تمام راست باز انسان ہیں۔ جو نوع انسانی میں گذر چکے تھے۔ اس میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے، نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیرووں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداء حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں، قرآن کے نزدیک "انعام یافتہ" انسان ہیں، اور انہی کی راہ "صراط مستقیم" ہے۔

خدا کے ان تمام رسولوں اور نوع انسانی کے راست باز افراد کی راہ کون سی راہ تھی؟ وہی راہ جسے قرآن دینِ حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے، سب نے یہی تعلیم دی کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ! "خدا کا ایک ہی دین

قائم رکھو، اور اس راہ میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ یہی راہ سچائی کی سیدھی راہ ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا الدین کو صراطِ مستقیم سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو اور صراطِ مستقیم ہی صراط اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی راہ سعادت۔

اِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۙ
صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ
الْاُمُوْرُ ۝
(۴۲: ۵۲-۵۳)

اور (اے پیغمبر) بلاشبہ تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، صراط اللہ۔ یعنی اللہ کی راہ کی طرف، وہ اللہ، کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اُسی کا ہے۔ ہاں، یاد رکھو، (کائناتِ خلقت کے) تمام کاموں کا مرجع اسی کی ذات ہے۔

اسی طرح وہ جا بجا کہتا ہے کہ خدا کے تمام رسولوں کی دعوت صراط مستقیم کی دعوت تھی۔ سورۂ نحل میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی نسبت ہے:- وَهَدٰهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۶: ۱۲۱) خدا نے اسے صراط مستقیم دکھا دی۔ سورۂ زُخرف میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زبانی سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۴۳: ۶۴) اللہ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے:- سورۂ انعام میں پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے، پھر سلسلۂ ابراہیمیؑ کے متعدد نبیوں کا جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ اُس کے بعد کہا ہے:- وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۶: ۸۷) ان سب کو ہم نے صراطِ مستقیم دکھا دی۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے صراطِ مستقیم سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ تم کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لئے کتنی ہی راہیں نکال لو، لیکن سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہی ہوگی۔ اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزلِ مقصود تک بحفاظت و امن پہنچ سکے گا۔ علاوہ بریں، سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہِ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تمام مسافر، خواہ کسی گوشے کے رہنے والے ہوں لیکن سب مل جُل کر وہی راہ اختیار کریں گے اور کبھی یہ نہ کریں گے کہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں میں متفرق ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے، ٹھیک، اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہی ہے۔ بہت سی نہیں ہو سکتیں، اور وہ اوّل دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک، اسی پر چل کر منزلِ مقصود کا سراغ پاؤ، تو چاہئے کہ اسی سیدھی راہ پر اکٹھے ہو جاؤ۔ فهو طریقة مستقیمة، سهلا، مسلوکا، واسعًا، موصلةً الی المقصود۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ
سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ۝ (۶: ۱۵۳)

اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے۔ بالکل سیدھی راہ پس اسی ایک راہ پر چلو اور طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمہیں خدا کی سیدھی راہ سے ہٹا کر، جدا جدا کر دیں گے۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ (اس کی نافرمانی سے) بچو!

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ جب "صراطِ مستقیم" کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمائی ہے۔

عن ابن مسعودؓ قال خط لنا رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطا بیدہٖ ثم
قال هٰذا سبیل اللہ مستقیما ثم خط

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا، یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے۔ بالکل سیدھا، اس کے بعد

خطوطاً عن یمین ذالک الخط و عن شمالہ، ثم قال وھذہ السبل لیس منھا سبیل الا علیہ شیطان یدعوا الیہ ثم قرأ ھذہ الاٰیۃ۔
(اخرجہ النسائی، احمد والبزاز وابن المنذر وابو الشیخ، والحاکم وصححہ)

اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں، اور فرمایا، یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لئے گئے ہیں، اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لئے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی:۔ وَ اِنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا الی آخرہ۔

اس سے معلوم ہوا، تمام اِدھر اُدھر کے ٹیڑھے ترچھے راستے "سُبُل متفرقہ" ہیں جو جمعیت بشری کو متحد کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں، اور درمیان کی ایک ہی سیدھی راہ "صراطِ مستقیم" ہے۔ یہ متفرق کرنے کی جگہ تمام رہروانِ منزل کو ایک ہی شاہراہ پر جمع کر دیتی ہے۔

یہ سُبُل متفرقہ کیا ہیں؟ اسی گمراہی کا نتیجہ ہیں، جسے قرآن نے "تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی سے تعبیر کیا ہے، اور تشریح اس کی اوپر گذر چکی۔

دینِ حقیقی کی راہ کا سیدھا ہونا، اور "سُبُلِ متفرقہ" یعنی خود ساختہ گروہ بندیوں کا پُر پیچ و خم ہونا، ایک ایسی حقیقت ہے۔ جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ لے سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لئے ہے، تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی راز نہ ہو، کوئی پیچیدگی نہ ہو۔ ناقابلِ حل معمّہ نہ ہو۔ اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا۔ ہر عقل اُسے بوجھ لے۔ ہر طبیعت اُس پر مطمئن ہو جائے۔ اچھا، اب غور کرو، یہ تعریف کس راہ پر صادق آتی ہے؟ اُن مختلف راہوں پر جو پیروانِ مذاہب نے الگ الگ گروہ بندیاں کر کے نکال لی ہیں، یا اُس ایک ہی راہ پر جسے قرآن اصلِ دین کی راہ بتلاتا ہے؟

ان گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے بوجھل عقیدوں، ناقابلِ فہم عقدوں، اور ناقابلِ برداشت عملوں کی ایک طول و طویل فہرست نہ ہو۔ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے تمام پیروانِ مذاہب کے مزعومہ عقائد و اعمال کا کیا حال ہے، اور اُن کی نوعیت کیسی ہے؟ مذہب کا عقل کے لئے معمّہ اور طبیعت کے لئے بوجھ ہونا، ایک ایسی بات ہے جو عام طور پر مذاہب کا خاصہ تسلیم کر لی گئی ہے، لیکن قرآن جس راہ کو دینِ حقیقی کی راہ کہتا ہے اس کا کیا حال ہے؟ اس کی راہ تو اتنی واضح، اتنی سہل، اتنی مختصر ہے کہ عقاید و اعمال کی پوری فہرست صرف دو لفظوں میں ختم کر دی جا سکتی ہے۔ ایمان اور عملِ صالح۔ اس کے عقاید میں عقل کے لئے کوئی بوجھ نہیں۔ اس کے اعمال میں طبیعت کے لئے کوئی سختی نہیں۔ ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک۔ ہر معنی میں اعتقاد و عمل کی سیدھی سے سیدھی بات۔ حنیفیۃ السمحۃ، لیلھا کنھارھا۔ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ؕ (۱:۱۸)

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔ اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہیں رکھی۔

بہرحال، قرآن کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ وہ راہ نہیں جو کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل، کسی خاص قوم، کسی خاص عہد کی راہ ہے، بلکہ خدا کی عالمگیر سچائی کی راہ، جو ہر جگہ اور ہر عہد میں نمایاں ہوئی ہے۔ اور ہر طرح کی جغرافیائی اور جماعتی حد بندیوں کے امتیازات سے پاک ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (۴۳: ۶۴)	اللہ میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے، پس اسی کی بندگی کرو۔ یہی صراط مستقیم ہے۔

علاوہ بریں بحث و نظر کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جو اس موقع پر پیش نظر رہنے چاہئیں :-

اوّلاً فلاح و سعادت کی راہ کو "سیدھی راہ" سے تعبیر کیا گیا، اور "سیدھی راہ" پر چلنا ایک بات ہے، جس کی سمجھ اور طلب بالطبع ہر انسان کے اندر موجود ہے، پھر اس کی پہچان بتلاتے ہوئے کوئی اس طرح کی تعریف نہیں کی۔ جس کے سمجھنے اور منطبق کرنے میں ذہنی کاوشوں کی ضرورت ہو، بلکہ ایک خاص طرح کے انسانوں کی طرف انگلی اٹھا دی کہ صراط مستقیم ان لوگوں کی راہ ہے :- اس اسلوب بیان نے ہر انسان کے سامنے صراط مستقیم کو ایک محسوس و مشہور صورت میں نمایاں کر دیا۔ ہر انسان خواہ کسی عہد اور کسی ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہو، لیکن اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہاں دو طرح کے انسان موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی راہ سعادت و کامیابی کی راہ ہے۔ ایک وہ ہیں جن کے حصے میں محرومی و شقاوت آئی ہے۔ پس کامیابی کی راہ کی پہچان اس سے زیادہ بہتر اور مؤثر طریقہ سے بیان نہیں کی جاسکتی کہ وہ کامیاب انسان کی راہ ہے۔ اگر اس کی پہچان منطقی تعریفوں کی طرح بیان کی جاتی، تو ظاہر ہے، نہ تو ہر انسان بغیر کاوش و فکر کے سمجھ سکتا، نہ قطعی طور پر کسی ایک راہ پر منطبق کی جاسکتی۔

ثانیاً جہاں تک انسانی فلاح و سعادت کا تعلق ہے، صراطِ مستقیم کی تعبیر ہی ہر لحاظ سے حقیقی اور قدرتی تعبیر ہو سکتی تھی۔ انسان کے فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو۔ لیکن صحت و درستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہو گی جو سیدھی راہ ہو، جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی، نقص و فساد ظہور میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا، فلاح و سعادت کے معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ گویا اچھائی کے معنوں میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے۔ جو تمام نوع انسانی کی عالمگیر تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے دارا یوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے، ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے "اے انسان! اہورا مزد کا (یعنی خدا کا) تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ سیدھا راستہ نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ"

پس صراطِ مستقیم پر چلنے کی طلب، زندگی کی تمام راہوں میں درستگی و صحت کی راہ چلنے کی طلب ہوئی۔ اور اسی لئے سعی و عمل کے ہر گوشے میں، انعام یافتہ وہی ہو سکتا ہے، جس کی راہ صراطِ مستقیم ہو۔

"المغضوب علیھم اور الضالین"

پھر "صراطِ مستقیم" کی پہچان صرف اس کے مثبت پہلو ہی سے واضح نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا ضد مخالف پہلو بھی واضح کر دیا گیا :- غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے۔ نہ اُن کی راہ جو گمراہ ہو کر بھٹک گئے۔

"مغضوب علیہ" گروہ "منعم علیہ" کی بالکل ضد ہے۔ کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے اور فطرت

کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصے میں انعام آتا ہے۔ نافرمانوں کے حصے میں غضب "گمراہ" وہ ہیں جو راہ حق نہ پا سکے، اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے۔ پس مغضوب وہ ہوئے جنہوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں، لیکن پھر اُس سے منحرف ہو گئے، اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی۔ گمراہ وہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے، اس لئے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں، اور صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہیں۔

"مغضوب علیہ" کی محرومی، حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے، اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ۔ پہلے نے پا کر رُوگردانی کی، اس لئے محروم ہوا، دوسرا پا ہی نہ سکا، اس لئے محروم ہے محروم دونوں ہوئے، مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔ کیونکہ اُس نے نعمت حاصل کر کے پھر اس کی روگردانی کی۔ اس لئے اُسے مغضوب کہا گیا، اور دوسرے کی حالت صرف گمراہی کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں فلاح و سعادت سے محروم آدمی ہمیشہ دو ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ جاحد اور جاہل۔ جاحد وہ ہوتا ہے جو حقیقت پا لیتا ہے، بایں ہمہ اُس سے روگردانی کرتا ہے۔ جاہل وہ ہوتا ہے جو حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے، اور اپنے جہل پر قانع ہو جاتا ہے، پس صراطِ مستقیم پر چلنے کی طلبگاری کے ساتھ، محرومی و شقاوت کی ان دونوں صورتوں سے بچنے کی طلب بھی سکھلا دی، تاکہ فلاح و سعادت کی راہ کا تصور ہر طرح کامل اور لغزشوں سے محفوظ ہو جائے۔

جہاں تک مذہبی صداقت کا تعلق ہے، دونوں طرح کی محرومیوں کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے قدم صراطِ مستقیم پر استوار ہو گئے تھے، اور فلاح و سعادت کی تمام نعمتیں اُن کے لئے مہیا تھیں۔ بایں ہمہ انہوں نے رُوگردانی کی۔ اور راہِ حق کی معرفت حاصل کر کے پھر اس سے منحرف ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی قوم جو کل تک دنیا کی انعام یافتہ جماعت تھی، سب سے زیادہ محروم و نامراد جماعت ہو گئی۔ اسی طرح کتنی ہی جماعتیں ہیں جن کے سامنے فلاح و سعادت کی راہ کھول دی گئی، لیکن انہوں نے معرفت کی جگہ جہل، اور روشنی کی جگہ تاریکی پسند کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راہ حق نہ پا سکے، اور نامرادی و محرومی کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

احادیث و آثار میں اس کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے اس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ترمذی اور احمد و ابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "المغضوب" یہودی ہیں اور "الضالین" نصاریٰ ہیں۔ یقیناً اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ مغضوب سے مقصود صرف یہودی اور گمراہ سے مقصود صرف نصاریٰ ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مغضوبیت اور گمراہی کی حالت واضح کرنے کے لئے دو جماعتوں کا ذکر بطور مثال کے کر دیا جائے چنانچہ ان دونوں جماعتوں کی تاریخ میں ہم دونوں حالتوں کا کامل نمونہ دیکھ لے سکتے ہیں۔ یہودیوں کی قومی تاریخ مغضوبیت کے لئے اور عیسائیوں کی تاریخ گمراہی کے لئے عبرت و تذکیر کا بہترین سرمایہ ہے۔

قرآن کے قصص اور استقراءِ تاریخی

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے ہدایت و تذکیرِ اُمم کے لئے جن جن اصلوں پر زور دیا ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل، پچھلی قوموں کے ایام و وقائع اور ان کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہے کائنات ہستی کے ہر گوشے

کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لئے بھی خدا کا قانونِ سعادت و شقاوت ایک ہی ہے، اور ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور اس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں۔ جس طرح سنکھیا کی تاثیر اس لئے بدل نہیں جا سکتی کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لئے متغیر نہیں ہو جا سکتے کہ کس ملک میں پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے، اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے، تو مستقبل میں بھی ہمیشہ شہد، شہد ہی رہے گا، اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہوگی۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے، ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

(۳۳ : ۶۲)

جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اُن کے لئے اللہ کی سنت یہی رہی ہے (یعنی اللہ کے قوانین و احکام کا دستور یہی رہا ہے)، اور اللہ کی سنت میں تم کبھی رد و بدل نہیں پاؤ گے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

(۳۵ : ۴۳)

پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس سنت کی جو اگلے لوگوں کے لئے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو، تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی سنت کے احکام پھیر دیئے جائیں۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝ (۱۷ : ۷۷)

(اے پیغمبر!) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے ان کے لئے ہماری سنت یہی رہی ہے، اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں۔

چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگزشتیں بار بار سناتا ہے، پھر جا بجا ان کے عبرت و بصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے جن پر اقوام و جماعات کا عروج و زوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے، کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی ان ان اعمال کا انعام تھے، اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی ان کی بدعملیوں کی پاداش تھی۔ وہ اچھے نتائج کو "انعام" کہتا ہے۔ کیونکہ یہ فطرتِ الٰہی کی قبولیت ہے۔ بُرے نتائج کو "غضب" کہتا ہے، کیونکہ یہ قانونِ الٰہی کی پاداش ہے۔ وہ کہتا ہے، جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول پیدا ہو چکا ہے۔ تم کیوں کر انکار کر سکتے ہو کہ گیارہویں مرتبہ بھی ویسا ہی معلول پیدا نہ ہوگا؟

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

(۳ : ۱۳۱)

تم سے پہلے بھی دنیا میں (خدا کے) احکام و قوانین کے نتائج گزر چکے ہیں، پس ملکوں کی سیر کرو، اور دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ جنہوں نے اللہ کے احکام و قوانین کو جھٹلایا تھا۔

قرآن کی سورتوں میں ایک بڑی تعداد ایسی سورتوں کی ہے، جو تمام تر اسی مطلب پر مشتمل ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں جس قدر بیان بھی پچھلے عہدوں کے وقائع و قصص کا ہے، وہ تمام تر سورۂ فاتحہ کی اسی آیت کی تفصیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح

اچھا، اب چند لمحوں کے لئے سورۂ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو، اور دیکھو اس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقاید و تصور کی جو روح مضمر ہے۔ وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے؟ سورۂ فاتحہ ایک دعاء ہے؛ فرض کرو، ایک انسان کے دل و زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے۔ اس صورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں، اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن کی حمد میں جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے، اور اس لئے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اُسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اُس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اُسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اُس کے لئے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی اُس کی نسبت جانتا ہے، وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا، اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، صرف تیری ہی ایک ذات ہے۔ جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے۔ اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت، دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدّعا ہے جس سے زبانِ احتیاج آشنا ہوتی ہے، لیکن کونسی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقہ کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے، لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے، جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے، وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک، یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو، مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لئے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا، وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ ایک یہ کہ اس کی خداپرستی، خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خداپرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا، اور دعوتِ قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔